E - COPY

کتاب و سنت اور اسلافِ اُمت کی تعلیمات کا علمبردار

ماہنامہ

اشرف الجرائد حیدرآباد

Volume:14 Issue:6 August 2021

مدیر
مولانا محمد عبدالقوی

ادارہ اشرف العلوم ٹرسٹ حیدرآباد
www.iauth.in

اشرف الجرائد میں شامل تمام مضامین کی تمام جزئیات سے مدیر کا اتفاق ضروری نہیں

آئینۂ مضامین

اشرف الجرائد کی توسیع و اشاعت میں حصہ لے کر اشاعتِ دین کا ثواب حاصل فرمائیں۔ ادارہ

درسِ قرآن



یہ خوبیوں بھرا قرآن ہمارے لئے ہے

مولانا محمد عبدالقادر فرید قاسمی*

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ۝۵۷ (سورہ یونس:۵۷)

ترجمہ: اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف ایک ایسی چیز آئی ہے جو نصیحت ہے اور دلوں میں جو روگ ہیں ان کے لیے شفاء ہے اور رہنمائی کرنیوالی ہے اور رحمت ہے ایمان والوں کے لیے۔

توضیح: اس امت پر انعامات خداوندی میں سے ایک بڑا انعام کتاب ھدایت ہے جس کے نزول کا مقصد انسانیت کو کفر وعصیاں کے ظلمت کدہ سے نکال کر نورِ ایمان وطاعت سے روشناس کرانا ہے، اس کتاب کی جامعیت یہ ہے کہ اس میں انسانی شعبہائے حیات کی تئیں رہنمائی موجود ہے جس سے استفادہ کر کے ایک انسان کامل انسان بن سکتا ہے، اس کتاب الٰہی کا اعجاز یہ ہے کہ اس کی خوبیوں کا سمندر ناپیدا کنار ہے تقریباً ساڑھے چودہ صدیوں سے حضرات مفسرین اس پر خامہ فرسائی کر رہے ہیں ہر غواص اس کی خوبیوں وآب دار موتیوں سے اپنے دامن کو بھر رہے ہیں، امت کے سامنے پیش کر رہے ہیں اور یہ سلسلہ تاہنوز جاری ہے تاقیام قیامت جاری رہے گا آج تک کسی نے اسے اپنے قلمی احاطہ میں لانے کا دعویٰ کیا ہے اور نہ آگے کوئی کر سکتا ہے، یہ اعجاز قرآن نہیں تو اور کیا ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود فرمایا تھا لا تنقضی عجائبہ اس قرآن کی خوبیاں ختم نہیں ہوسکتیں، قرآن کریم کی بے شمار خوبیوں واوصاف میں سے خود قرآن نے اپنے چار نمایاں اوصاف کو ذکر فرمایا ہے یہ اوصاف پانی سے بھرے بادل کی طرح ہیں جو بلا لحاظ مذہب انسانیت پر برستا ہے سب یکساں مستفید ہوتے ہیں ایسے ہی ان اوصاف قرآن سے ہر اس انسان کو فائدہ ہوسکتا ہے جو طلب صادق اور محبت کے ہاتھوں، خلوص نیت اور جذبۂ عمل کے ساتھ اسے پڑھے تو اس کی تشنگی۔سیرابی میں، جہل۔علم میں، گمراہی۔ھدایت میں، بد طینتی۔حسن طینت میں، غفلت ولا پرواہی۔شعور وآگہی میں تبدیل ہوسکتی ہے۔

* ذمہ دار ادارہ حسیب المدارس، حیدرآباد

اس جہاں میں دو نعمتیں عظیم ہیں ایک کتاب اللہ دوسری شارح کتاب اللہ یعنی حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، یہ دو نعمتیں سب اعلیٰ وافضل ہیں ان کی اطاعت پیروی کر کے انسان بھی اکمل وارفع بن سکتا ہے اور جب انسان کامل بن جاتا ہے تو بقول صاحب معارف القرآن سارا جہاں درست ہو جاتا ہے اور یہ دنیا بھی جنت بن جاتی ہے۔

قرآن کریم کے اوصاف وخصوصیات میں سب سے پہلی صفت "موعظة من ربكم " ہے کہ قرآن تمہارے رب کی طرف سے تذکیر وموعظت ہے، موعظة کا اصل معنی التذكير بالتزام الحق والخير واجتناب الباطل والشر بأسلوب يلين القلوب ويرقق النفوس حق اور خیر کو لازماً اپنا لینا، باطل وشر سے اجتناب کو ایسے اسلوب کے ساتھ بیان کرنا کہ انسان کا دل نرم پڑ جائے، دنیا کی غفلت کا پردہ چاک ہو، آخرت کی فکر سوار ہو جائے، سارا قرآن اسی مواعظ حسنہ کا شاہکار ہے۔

دوسری صفت" شفاء لمافي الصدور" ہے شفاء کی تعریف ہے هو الدواء الشافي من كل مايؤذي کہ ہر تکلیف دہ مرض کے لیے شافی علاج ہے، قرآن نے "لمافي الصدور" کی قید بڑھا کر واضح کر دیا کہ جتنے امراض باطن ہے قرآن ان سب کے لیے صحت وشفا کا نسخہ اکسیر ہے، انسان کی تباہی میں جسمانی امراض سے زیادہ باطنی قلبی امراض شدید ہوتے ہیں اسی وجہ سے "لمافي الصدور" کا اضافہ ہے ورنہ تو قرآن پاک کا یہ اعجاز ہے کہ وہ جہاں امراض قلب کے لیے شافی ہے وہیں امراض جسمانی کے لیے بھی کافی ہے۔

تیسری صفت "هدىً " ہے ہدایت کا ایک معنیٰ العلم بالحق والعمل به حق کا علم اور اس پر عمل ایک اور معنی تفسیر میں یہ ملتا ہے هو الارشاد والدلالة بلطف الى مايوصل الى المقصود والبغية نرمی کے ساتھ ایسی رہنمائی کرنا جو مقصود ومطلوب تک پہونچا دے، قرآن کا نزول ہوا ہی ہے حق یقین کی طرف دعوت دینے کے لیے، قرآن ایک عظیم وبلیغ مبلغ ہے جو انسانوں کے اذہان کی سطح کو سامنے رکھ کر مختلف اسلوب کے ساتھ حق ویقین کو اسبابِ ہدایت کو واشگاف کرتا ہے۔

چوتھی صفت "رحمة " ہے رحمة کی تعریف هي مايحصل من الخير والاحسان والثواب العاجل والآجل خیر وبھلائی اور دنیوی نفع واخروی ثواب کا پانا ہے۔

ان خوبیوں کے حامل قرآن کو اللہ تعالیٰ نے ہماری رشد وھدایت، فلاح وبہبودگی کے لئے نازل کیا ہے اور ہماری کج فہمی، نادانی یہ ہے کہ ہم اپنا فوز وفلاح وہاں تلاش کرتے ہیں جہاں ہم نے ہمیشہ نقصان ہی اٹھایا ہے، پورے عالم میں اس قدر ذلت وخواری کے باوجود ہم کو اپنی کامیابی قرآن میں نظر نہیں آتی یہ ہماری حرماں نصیبی ہے۔ فاعتبروا يا اولى الابصار ۔ خدا تعالیٰ ہم کو اس حوالہ سے بصیرت عطا فرمائے۔ آمین



درس حدیث

جسم کے ہر جوڑ کا صدقہ کیسے ادا کریں؟

مولانا محمد احمد علی قاسمی*

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللہُ عَنْہُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: كُلُّ سُلاَمَى عَلَيْهِ صَدَقَةٌ كُلَّ يَوْمٍ، يُعِينُ الرَّجُلَ فِي دَابَّتِهِ، يحامِلُهُ عَلَيْهَا، أَوْ يَرْفَعُ عَلَيْهَا مَتَاعَهُ صَدَقَةٌ، وَالكَلِمَةُ الطَّيِّبَةُ، وَكُلُّ خَطْوَةٍ يَمْشِيهَا إِلَى الصَّلاَةِ صَدَقَةٌ، وَدَلُّ الطَّرِيقِ صَدَقَةٌ (رواہ البخاری: 2891)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: روزانہ انسان کے ہر جوڑ پر ایک صدقہ لازم ہے، اگر کوئی شخص کسی کی سواری کے سلسلے میں مدد کرے (جیسا کہ) اُس کو سہارا دے کر اُس کی اپنی سواری پر اُس کو سوار کردیا، یا اس کا سامان اُٹھا کر سواری پر رکھ دے تو یہ بھی صدقہ ہے، اچھی اور بھلی بات بولنا بھی صدقہ ہے، ہر قدم جو وہ نماز کے لئے اُٹھاتا ہے وہ بھی صدقہ ہے اور کسی اجنبی ناواقف مسافر کو راستہ بتادینا بھی صدقہ ہے۔

تشریح: اس صداقت وحقیقت کا کوئی بھی شخص انکار نہیں کرسکتا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہی کی ذاتِ عالی دراصل منعم حقیقی ہے، ہمارے وجود کا انگ انگ اُس کی نعمتوں اور احسانات سے بھرا ہوا ہے، سر سے پیر تک ایک ایک عضو کا حاصل ہونا اور اُس کا کام کرتے رہنا یہ اتنا بڑا فضل خداوندی ہے کہ اُس کا تصور انسان اِن دولتوں سے محروم لوگوں سے کرسکتا ہے، سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ پاک کی طرف سے اِس قدر انعامات واحسانات کی بارش ہے تو انسان کو اس کے حق کی ادائیگی کس طرح کرنا چاہیئے؟ مذکورہ حدیث دراصل اُسی سوال کے جواب کی طرف راہنمائی کرتی ہے، اس حدیث میں صرف انسان کے جوڑ کی بات کہی گئی ہے، ایک دوسری حدیث میں جو حضرت عائشہؓ سے مروی ہے اس میں جوڑوں کی تعداد تین سو ساٹھ بتلائی گئی ہے۔(مسلم شریف)

انسانی بدن میں تین سو ساٹھ جوڑ ہیں، جب انسان شام سے صبح کرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ اُس کے جسم کے تمام جوڑ صحیح سالم ہیں اور کام کر رہے ہیں تو یہ اللہ تعالیٰ کا عظیم احسان وانعام ہے، اِس احسان وانعام کے شکر کا

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا، حیدرآباد

تقاضہ یہ ہے کہ ہر جوڑ کے بدلے میں صدقہ کیا جائے ،صدقہ میں اگر مال خرچ کرنے کا حکم دیا جاتا (جو حق بہ جانب بھی ہے) تو بالکل بجا اور صحیح تھا؛ لیکن پھر بھی غریبوں کے لئے اس حکم کی تعمیل مشکل تھی ؛ اِس لئے حدیث شریف میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آسان صورت کی طرف راہنمائی فرمائی کہ نیک کاموں کو انجام دیا جائے تو یہی کام اس کی طرف سے صدقہ کے برابر ہو جائے گا۔

مذکورہ حدیث کے علاوہ حضرت عائشہؓ کی حدیث میں جن نیک کاموں کی طرف راہ بری فرمائی گئی ہے وہ یہ ہیں ،۱۔کلمہ سبحان اللہ، ۲۔کلمہ الحمد للہ، ۳۔کلمہ لا الہ الا اللہ، ۴۔کلمہ استغفر اللہ پڑھنا، ٦۔ ہر بھلا کام کسی کو بتا دینا ،۷۔ ہر بُرے کام سے کسی کو رُوکنا ،۸۔ دو شخصوں کے درمیان انصاف کرانا ، ۹۔ کسی کمزور انسان کی سواری پر سوار ہونے یا سامان اُٹھانے میں مدد کرنا ،۱۰۔ ہر اچھی بات کہنا۔ ۱۱۔نماز کے لئے مسجد جانے میں قدم اُٹھانا، ۱۲۔راستے سے تکلیف دہ چیز کو ہٹا دینا۔

اعمالِ صالحہ اور کارِ خیر کی فہرست کافی لمبی اور طویل ہے، یہ اور اِس کے علاوہ جو بھی نیک کام کا تقاضہ اور مطالبہ ہو تو ضرور اس کام کو انجام دینا چاہیئے ؛ تاکہ ہمارے جسم کے ہر جوڑ کی طرف سے اللہ تعالیٰ کے حضور میں شکرانہ اور صدقہ پیش ہو سکے ، اور ہم اللہ کے شکر گذار بندوں کی فہرست میں شمار ہو سکیں ، تاہم اگر کوئی کمزور شخص اتنے سارے کام نہ کر پاتا ہو تو ایسے کمزوروں کے لئے بھی سب کاموں کے بجائے صبح چاشت کی دو رکعت پڑھ لے تو یہ دو رکعت اس کے ہر جوڑ کی طرف سے کافی ہو جائے گا۔

حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:تم میں سے ہر شخص کے بدن کے ہر جوڑ پر ہر صبح ایک صدقہ لازم ہو جاتا ہے، چناں چہ ہر تسبیح ایک صدقہ ہے، ہر تحمید ایک صدقہ ہے، ہر تہلیل ایک صدقہ ہے، ہر تکبیر ایک صدقہ ہے، نیکی کا حکم دینا ایک صدقہ ہے، برے کام سے روکنا ایک صدقہ ہے، اور ان سب کاموں کے بجائے چاشت کی دو رکعتیں پڑھ لینا بھی کافی ہے۔(صحیح مسلم)۔

بہر حال! جسم انسانی میں جتنے جوڑ اللہ پاک نے بنائے ہیں (جس سے انسان حرکت وعمل کر سکتا ہے اور اُسے اپنی زندگی کے بے شمار حاجات وضروریات کی تکمیل کرتا ہے کہ اگر یہ جوڑ نہ ہوتے تو انسان پتھر کی طرح پڑا رہتا، نہ کوئی حرکت کر سکتا نہ عمل) اُس کے شکر کا تقاضہ یہ ہے کہ اپنے جسم کی تمام قوتوں اور طاقتوں کو بھلے اور نیک کام میں لگائے خاص طور پر گناہوں میں تو بالکل نہ لگائے ؛ بلکہ ہمت کر کے ہر جوڑ کے بدلہ کوئی نہ کوئی نیک کام کرنے کی ضرور کوشش کرے یا پھر دو رکعت چاشت کی نماز تو ترک نہ کرے کہ یہ بھی ہمارے لئے بہت حد تک کافی ہو سکتا ہے۔

اللہ پاک ہمیں اپنی نعمتوں کی قدردانی توفیق نصیب فرمائے۔آمین یارب العالمین۔

پیش گفتار

تحفظ شریعت اور فضلاء کرام کی ذمہ داریاں[۱]

از: مدیر

تحفظ شریعت کے عنوان کا مقصد یہ ہے کہ اہل حق کے عقیدے، جو نہایت توسط واعتدال پر مبنی ہیں، ان پر آنے والی آنچ کو دفع کیا جائے، درست اسلامی عقائد سے امت کو روشناس کرایا جائے، اور باطل وگمراہ فرقوں کا مسلسل تعاقب کیا جائے۔

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ عقائد وہی معتبر ہیں جن پر علمائے اہل السنۃ والجماعۃ کا اتفاق ہے، یہی برحق موقف ہے، اس کے علاوہ ہر موقف بدعت وگمراہی ہے۔ نیز اہل السنۃ والجماعۃ کی سچی، مناسب اور معتدل ترجمانی علمائے دیوبند ہی نے کی ہے، اور اسی مسلک میں اعتدال وتوازن کی ہمیں یہ خصوصیت ملتی ہے، ورنہ افراط وتفریط عام ہے۔

علمائے دیوبند سے کون مراد ہیں؟

علمائے دیوبند سے مراد صرف علمائے دارالعلوم یا فضلائے دارالعلوم نہیں ہیں؛ بلکہ جو عالم بھی دیوبندیُ الفکر ہو وہ دیوبندی عالم ہے خواہ کسی مدرسے سے فارغ ہو بہ قول حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ: دیوبندیت کوئی مذہب یا فرقہ نہیں؛ بلکہ مسلک اہل السنۃ والجماعۃ کا ایک جامع مرقع اور مکمل ایڈیشن ہے، جس میں اہلِ سنت کی ساری شاخیں اپنی اصل سے جڑی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

اہلِ حق کی اس بابرکت جماعت نے اپنے ہر عقیدے اور عمل کی سند سلف صالحین سے لی ہے، جو

---

۱ تحفظ شریعت ٹرسٹ کے سہ ماہی مشاورتی اجلاس میں مدیر محترم مدظلہ العالی نے یہ خطاب فرمایا ہے جسے شیخ ابراهیم ندیم نعمانی نے مرتب کیا ہے، نو فاضل علماء سے نہایت اہم اور فکر انگیز خطاب فرمایا ہے، قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے شروع ہوکر مسند الہند حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اوران کے خانوادے میں جمع ہوگئی ہے۔ پھر جاننا چاہیے کہ مسلک دیوبند کی بنیاد چار اکابر کے افکار ونظریات پر ہے، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا خلیل احمد انبیہٹویؒ اور حکیمُ الامت حضرت مولانا تھانویؒ، بعد میں ہر دور کے معتبر ومستند علماء نے اپنی فکر وعمل سے اس کی تشریح وتوضیح کی ہے؛ لیکن ان سب میں بھی ہم عقائد اور مسائل کے سلسلے میں بطور عنوان وعلَم کے حضرت گنگوہی کو اپنا امام مانتے ہیں، جو کہ شاہ ولی اللہؒ کی تفہیم شریعت اور تصور دین کے پابند تھے، او پر جا کر امام ابو منصور ماتریدیؒ کی تحقیق کے مطابق عقائد اسلام پر یقین رکھتے ہیں، ترجیحی طور پر ہم نے اشاعرہ کے بعض مسائل کے مقابلہ میں ان کو اختیار کیا ہے، ویسے اشاعرہ اور سلفیہ (امام احمد بن حنبلؒ اوران کے متبعین) بھی اہل سنت والجماعت ہیں۔

یہ ذہن میں رہنا چاہئیے کہ سلفیت کی قدیم اصطلاح اور جدید استعمال میں بہت بڑا فرق ہے، جیسے اہلِ حدیث کی قدیم اصطلاح اور جدید استعمال میں بونِ بعید ہے۔

اس وقت سب سے بڑا چیلنج اصولِ دین سے بے خبر نام نہاد اسلامی اسکالرز کے سطحی خیالات اور اختراعی نظریات کا مقابلہ ہے، بنیادی واعتقادی اصول میں سلف کا دامن چھوڑنا بڑی گمراہی ہے، آج ہر شخص ذاتی مطالعے کی بنیاد پر اپنے حاصل مطالعہ کو حقیقتِ دین اور منشاء نبوت بتانے پر مصر ہے۔

اوراب تو سوشل میڈیا ایک آفت بن چکی ہے، روز ایک محقق کھڑا ہوتا ہے، روز ایک مبلغ تیار ہوتا ہے، روز ایک تحریک وجود میں آتی ہے؛ جو بیچارے بھولے بھالے مسلمان ہیں وہ ان کی اتباع میں لگ جاتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کبھی عوام الناس پر ایسا فتنہ نہیں آیا جیسا اب آیا ہوا ہے اس لیے کہ پہلے علماء کے درمیان جو اختلاف ہوتا تھا وہ انہی میں محدود ہوکر رہ جاتا تھا، آگے بڑھنے کے وسائل نہیں ہوتے تھے، اب سوشل میڈیا ایک کارخانہ ہے، اچانک ایک خیال ذہن میں آیا اس کو تحریری قالب میں ڈھال کر چلا دیا۔

ہم اغیار سے پیچھے کیوں؟

ہمارا حال اس زمانے میں یہ ہے کہ ہمارے علماء بڑی بڑی خدمات کررہے ہیں اور مستند ومعتبر طریقوں پر کررہے ہیں مگراُن کی خدمات عوام تک کماحقہٗ نہیں پہونچ پاتیں، خصوصا اہل حق کی تبلیغ واشاعت بہت ہی زیادہ محدود ہے، آپ غور کرکے دیکھیں کہ جو کچھ کام ہورہا ہے اگر اس کا باطل کے کام اوران کی جستجوؤں سے تقابل کیا جائے تو ہمارا کام بہت کم ثابت ہوگا، ہماری غلط فہمی کی وجہ صرف اس طبقے پر نظر کرنا ہے جو ہمارے اطراف ہے جو کہ بہت محدود ہے اور ایک طبقہ جو ہم سے دور ہو چکا ہے اس کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

آج سے تقریباً پچیس سال قبل حضرت مفتی سعید احمد پالن پوریؒ تمل ناڈ میں آئے ہوئے تھے، میں بھی کسی کام سے وہاں گیا ہوا تھا، حضرتؒ کی مجلس میں گفتگو ہوئی کہ ہمارا کام انٹرنیٹ پر بہت کم ہو رہا ہے۔ حضرتؒ نے اس وقت فرمایا تھا کہ آج کی تاریخ میں نیٹ پر دس ہزار صفحات اہل قرآن کے ہیں، اس کے مقابلے میں ہمارے پاس کیا کام ہوا ہے؟ اتفاق سے ہم جہاں بیٹھے ہوئے تھے، وہاں ایک کمپیوٹر رکھا ہوا تھا، اس وقت ہم لوگ استعمال بھی نہیں جانتے تھے، ہم نے ایک شخص سے کہا کہ اہل قرآن کی ویب سائٹ پر یہ سوال لکھ کر بھیجو کہ ''حدیث کے بغیر قرآن فہمی کیسے ممکن ہے؟'' چناں چہ سوال لکھ کر بھیج دیا گیا، اس کے بعد ہم ظہرانے میں مشغول ہو گئے، مشکل سے آدھا گھنٹہ ہوا ہوگا، کھانے کے بعد ہم نے کہا کہ دیکھیں! کچھ جواب آیا ہے یا نہیں؟ دیکھا گیا تو جواب موجود تھا، جواب کا حاصل یہ تھا: آپ کی بات کا مطلب یہ ہے کہ اگر حدیثیں نہ ہوں تو قرآن ڈسٹ بِن میں ڈال دیئے جانے کے قابل ہے؟ نعوذ باللہ من ذلک! آپ غور کیجیے کہ اگر چہ یہ ہمارے نزدیک نہایت ہی نامعقول جواب ہے؛ لیکن عام آدمی کے نزدیک نہایت معقول جواب ہے، اب اس کا ذہن اسی ترتیب پر چلے گا، اور وہ ان کے دام تزویر میں گرفتار ہو جائے گا۔

یہ آج سے کوئی پچیس سال پہلے ان کی سرگرمیوں کا حال تھا کہ صرف آدھے گھنٹہ میں سوال کا جواب موجود تھا، اب جب ہم ان کا مقابلہ کر رہے ہیں، تو کس رفتار سے کر رہے ہیں؟ ان لوگوں کے وسائل کتنے ہیں ہمارے کتنے ہیں؟ ہم خود اس کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کام ہمارا بھی ہو رہا ہے اور اللہ کے فضل سے اُمید ہے کہ حق کا ایک دن غلبہ ہوگا۔

یہاں یہ بات بھی عرض کر دوں کہ اس کام کو مستقل کام سمجھ کر کیا جائے، کوئی بھی کام ضمنی طور پر ترقی نہیں کرتا، کام کو اگر مقصود بنا لیا جائے تبھی وہ ترقی کرتا ہے، اگر ہم کھوجنا شروع کر دیں، اور مستقل نظر رکھیں، تو روز ہزاروں باطل نظریات سامنے آئیں گے۔ جب ہماری نظر میں ایسی کوئی چیز آ جائے جو حق کو نقصان پہنچانے یا اہلِ حق کی تنقیص کرنے والی ہے تو فوراً اس کا جواب دیدو! چاہے کوئی سنے یا نہ سنے، جواب تو آ جانا چاہیے، واقعہ یہ ہے کہ ہماری روایتی دنیا میں سوال و جواب کی کوئی خاص قدر و قیمت نہیں ہے؛ حالاں کہ اہل باطل کے ہاں اس کی بہت زیادہ اہمیت ہے، کسی نے کوئی بات کہی، کسی اور نے اس کا جواب دے دیا، تو اس پر ضرور غور وفکر کیا جائے گا جواب دینے والا چاہے کوئی ہو اس سے اُنہیں مطلب نہیں؛ مگر غور ضرور کیا جائے گا، جب وہ دیکھ لیں گے کہ ہمارا رد کیا گیا ہے تو یقیناً ہمارا جواب ان کے علم میں آ جائے گا، اور احقاقِ حق کا ہمارا کام پورا ہو جائے گا، اب علم میں آنے کے بعد وہ اپنی غلطی پر نادم ہوگا یا نہیں؟ اگر نادم ہوگا تو اپنی غلطی سے رجوع کرے گا، یا اپنی ہی بات

ثابت کرنے کی کوشش کرے گا، اِن باتوں کے ہم ذمہ دار نہیں ہیں، ہمارا کام بات کو پہونچانا تھا، سو وہ پہنچ گئی، ما علی الرسول الا البلاغ المبین، ہاں! اس بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ بات واضح ہو، صاف ہو، مدلل ہو اور سامنے والے کی فہم کے مطابق ہو۔

اس طرح اگر ہم ہر دن باطل کے ایک شگوفے کا جواب بھی دیں تو انشاء اللہ سال بھر میں تقریباً تین سو ساٹھ غلط نظریات اور باتوں کا جواب ہوجائے گا۔ بہرحال جن علماء کو اللہ نے اس کا سلیقہ دیا ہے، اور بات پیش کرنے کے طریقے سے نوازا ہے وہ اس کام کو اپنے اوپر اس طرح لازم کرلیں جیسے کھانا، پینا، سونا ضروری سمجھا جاتا ہے اسی طرح اس کام کو بھی ضروری سمجھیں! یہی تحفظ شریعت ہے۔

کام کا نہج کیسا ہو؟

انگریزی میں بھی کام کی سخت ضرورت ہے، چوں کہ ان فتنوں میں پڑنے والا خاص طبقہ انگریزی دانوں کا ہی ہے، اور فتنے بھی انگریزی میں زیادہ ہیں، بہت سے نوجوان سوشل میڈیا، واٹس ایپ، فیس بک، یوٹیوب وغیرہ بہت زیادہ دیکھتے ہیں، اور گم راہ ہوتے ہیں، حالاں کہ تعلیم یافتہ ہوتے ہیں لیکن اردو نہ جاننے کی وجہ سے اور علماء سے دوری کی وجہ سے راہ راست سے ہٹ جاتے ہیں، بل کہ رفتہ رفتہ کئی لوگ تو دین اسلام سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں (الامان الحفیظ) حالاں کہ پشتوں سے مسلمان چلے آرہے ہیں اور مومن گھرانوں میں پیدا ہوئے ہیں؛ لیکن مذکورہ کمزوریوں کی بناء پر ان کا جو حال ہو رہا ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ ہمارا پیغام ان تک نہیں پہنچ پایا، ان کی بے راہ رویوں سے ہم باخبر نہیں، ان کے عقائد و نظریات سے ہم واقف نہیں ہیں؛ جب باخبر نہیں تو ہم ان کا مقابلہ کیسے کریں گے؟ لہذا ایک طبقہ ایسا ہو جو باضابطہ اس کو دیکھے، جانچے، اور دیکھنے والا طبقہ بھی دین کی سمجھ بوجھ رکھتا ہو، ورنہ اس بات کا خطرہ ہوتا ہے کہ وہ خود کسی غلط کو صحیح سمجھ کر نہ بیٹھ جائے، ایسا عالم ہو جو انگریزی اور اردو دونوں زبانوں پر عبور رکھتا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا کام صرف تسلی کی حد تک ہی ہے، ضرورت کی تکمیل نہیں ہو رہی ہے، ضرورت بہت زیادہ ہے۔ پہلے تو اسباب و وسائل کی کمی تھی، اگر ہم کچھ لکھتے بھی تھے تو اسے کوئی شائع کرنے والا نہیں تھا، چھپ بھی جائے تو پڑھنے والوں کا دائرہ محدود ہوتا جا رہا تھا، اب چوں کہ ماحول ہی ایسا ہوگیا ہے کہ ہر ایک اپنے نظریے اور اپنے عقیدے کو آزادانہ طریقہ سے لکھ سکتا ہے، بول سکتا ہے، تو اب لکھنے اور بولنے کے مواقع بہت مل رہے ہیں، تو اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

ایک مرتبہ میں تمل ناڈ میں تھا، ایک پرچہ تمل میں چھپا ہوا ملا، وہاں کے ایک مقامی ساتھی سے اس کو پڑھنے کے لیے کہا گیا تو اس کا عنوان اس طرح تھا: (دو ڈاکو امام بخاری و امام طبری) اس میں لکھا تھا کہ انہوں

نے حدیث وتفسیر کا ستیاناس کر دیا ہے، اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو ہم قرآن وحدیث، دین وشریعت کو صحیح طور پر سمجھتے! وغیرہ وغیرہ۔ ان واقعات سے ہمیں عبرت لینی چاہیے اور غور کرنا چاہیے کہ ہم پر تحفظ شریعت کی ذمہ داری کس درجہ عائد ہوتی ہے؟

عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں

اس وقت دنیا بھر میں آگ لگی ہوئی ہے، امت کی نئی نسل پتنگوں کی طرح اس پر جھپٹ رہی ہے، اور ہم آشیانوں میں مطمئن بیٹھے ہیں، آپس میں دست وگریباں ہیں آگ کے بجھانے کی کوئی فکر نہیں۔ اگر ہماری غفلت کا یہی حال رہا تو یہ آگ ہمارے گھروں کو جھلسا سکتی ہے، ہمارے سامنے اس کی کئی مثالیں موجود ہیں، علامہ تمنا عمادی، مولانا حبیب الرحمن کاندھلوی وغیرہ کی مثالیں عبرت کے لئے بہت کافی ہیں، اُن کے خاندان اہلُ اللہ کے خاندان تھے، ایسے گھر میں ایک شخص منکر حدیث بن گیا، دین دار گھرانہ تھا مگر ان کی نسلیں بگڑ گئیں، اس لیے اللہ سے پناہ مانگنی چاہیے، اپنی صلاحیت پر فخر کرنے سے بچنا چاہیے، ہمیشہ محتاط ومحتاج رہنا چاہیے، فتن سے حفاظت اور ہدایت پر ثبات کی دعا کرنی چاہیے، نیز دوسروں کے لیے سعی وجہد کرتے رہنا چاہیے، ہم سے جس قدر ہو سکے احقاق حق کریں، اور ابطال باطل کا فریضہ انجام دیں، اپنوں کے جزوی اختلافات کے درپے ہونے کے بجائے دوسروں کے باطل نظریات کی طرف زیادہ توجہ دی جائے۔ اس موقع پر کسی شاعر کا یہ شعر یاد آرہا ہے کہ ؎

گل بوسی کے اس جذبے میں چبھ جائیں گے کچھ کانٹے بھی
اپنوں کے نشتر سہہ لینا۔۔۔ٹکرانا فقط بے گانوں سے

ہاں! مگر جب بات عصمت انبیاء اور عظمت صحابہؓ کی ہو، عقائد کے تحفظ کی ہو، اجماعی مسائل میں گم راہی کی ہو تب تو ان کا بھی تعاقب ہوگا۔ یاد رکھیں! مسلک دیوبند کا تحفظ بھی ہماری ذمہ داری ہے، اس وجہ سے نہیں کہ یہ ہمارے اکابر کا مسلک ہے؛ بل کہ اس وجہ سے کہ یہ اہل سنت والجماعت کی سب سے مناسب ومعتبر ترجمانی ہے۔

احقاقِ حق کے لیے تحفظ کا کام ہونا چاہیے، اس کے مختلف پہلو ہیں، ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کی جائے، فضولیات ولایعنی چیزوں سے دور رہیں، حضرت تھانویؒ کا ملفوظ ہے کہ جنت میں آدمی کو بے کار گزارے گئے وقت کے علاوہ کسی اور بات کا افسوس نہیں ہوگا۔ فویل للقاسیۃ قلوبھم من ذکر اللہ الخ

بس اس وقت جو باتیں ذہن میں آئیں عرض کر دیں، وہی پرانی باتیں ہیں جو بارہا کہی جاتی رہتی ہیں۔

حضرت قاری امیر حسن صاحبؒ فرماتے تھے کہ دین چودہ سو سال پرانا ہے، نئی بات کہاں سے لائیں گے؟ نئی بات بول بھی نہیں سکتے اور اگر بولیں تو قبول بھی نہیں کی جائے گی۔ پرانی ہی باتوں کو اچھے اور عمدہ انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے، نئی بات تو کچھ ہے بھی نہیں! اخلاص کی دعا کرتے رہنا چاہیے، اختلافات تو بہرحال ہوتے ہی ہیں، سگے بھائیوں میں خون ایک ہونے کے باوجود ذوق وطبیعت میں جب اختلاف ہوسکتا ہے تو افکار ونظریات کا اختلاف بھی ہوگا، اس لیے اس کو زیادہ اہمیت نہ دی جائے، آپس میں بھڑنے کے بجائے دشمنانِ دین کا مقابلہ کیا جائے۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ نوجوان علماء اہلُ اللہ کی سرپرستی میں کام کریں، ان کی ریاضت کا نور ان کی زبان اور نظر سے ہمارے دل کے اندر اُترتا ہے۔

(بقیہ صفحہ ۱۵ سے)

اور کھاتے رہے یہاں تک کہ سیر ہوگئے، پہلے لوگ چلے گئے پھر آپ نے اور آٹھ کو بلوایا اور میں نے آٹھ کو اندر بھیجا انہوں نے تناول کیا اور فارغ ہوگئے، پھر آپ نے مجھے حکم دیا کہ آٹھ کو بھیجو، میں بھیجتا رہا یہ سلسلہ چلتا رہا یہاں تک اسّی (۸۰) لوگ خوب سیر ہوکر کھالئے، پھر آپ نے مجھے بُلایا اور میری ماں اور ابوطلحہؓ کو بلوایا اور فرمایا کہ کھاؤ، ہم سب سیراب ہوکر کھائے پھر آپ نے کھانے پر سے اپنا دستِ مبارک ہٹالیا، اور فرمایا: اُم سلیم! تم نے جب کھانا پیش کیا تھا اتنا تو تھا نہیں؟ تو انہوں نے کہا کہ میرے ماں باپ آپ پر قربان! اگر میں ان لوگوں کو کھانا کھاتے نہ دیکھتی تو کہتی کہ ہمارے کھانے میں کچھ کمی نہ ہوئی۔

گوشۂ سیرت

حضرت ابوطلحہؓ کے گھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بابرکت دعوت

از: مولانا خواجہ نصیرالدین قاسمی*

حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ میں ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا، دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اصحابؓ کے ساتھ بیٹھے گفتگو فرما رہے ہیں اور پیٹ پر کپڑا باندھے ہوئے ہیں، میں نے صحابہؓ سے وجہ پوچھی تو انھوں نے بتایا کہ بھوک کی وجہ سے، میں ابوطلحہؓ کے پاس گیا اور کہا: ابو! میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھوک کی وجہ سے پیٹ پر کپڑا باندھے ہوئے دیکھا ہے۔ ابوطلحہؓ اپنی اہلیہ (یعنی میری والدہ اُم سلیمؓ) کے پاس گئے اور پوچھا کہ کچھ ہے؟ انہوں نے بتایا کہ ہاں! کچھ روٹی کے ٹکڑے اور کھجور ہیں، اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تنہا تشریف لائیں تو ہم سب سیر ہوں گے اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کوئی اور بھی آجائے تو کم پڑ جائے گا۔

ابوطلحہؓ نے مجھ سے کہا: انس! تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جاؤ اور قریب میں کھڑے رہو، جب آپ اُٹھ جائیں اور صحابہ کرامؓ ایک ایک کر کے سب چلے جائیں اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے گھر کے دروازہ پر پہونچ جائیں تب کہنا کہ میرے ابو نے آپ کو بُلایا ہے، میں نے ایسا ہی کیا، اور کہا کہ ابو، آپ کو بلائے ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہؓ کو آواز دی ''ارے بھائی چلو''۔ اور میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا اور سب کو لے کر ہمارے گھر چلے آئے اور ہاتھ چھوڑ دیا، میں گھر میں افسردگی سے گیا کہ اتنے سارے لوگ آگئے ہیں، میں نے ابّا سے کہا کہ میں نے تو صرف حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا تھا لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب کو بُلا لائے، ابوطلحہؓ نے باہر آکر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ میں نے تو انسؓ کو صرف آپ کو بُلانے کے لئے کہا تھا، میرے پاس ان سب کی ضیافت کی سکت نہیں،

تو آپ نے فرمایا: جاؤ، تمہارے پاس جو کچھ ہے اللہ عزوجل اس میں برکت دے گا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے اور فرمایا کہ تمہارے پاس جو کچھ ہے میرے پاس لے آؤ، آپ کے ساتھ آنے والے سب گلی میں بیٹھ گئے، ہم نے روٹی کے ٹکڑے اور کھجور حصیر پر آپ کے سامنے رکھ دئے آپ نے اس میں برکت کی دعا کی، اور فرمایا کہ میرے پاس آٹھ آدمی کو بھیجو، میں نے آٹھ کو چھوڑا، آپ نے اپنی ہاتھ کھانے کے اوپر رکھا اور فرمایا کہ اللہ کا نام لو اور کھاؤ، چناں چہ وہ آپ کے دست مبارک کے نیچے سے لیتے رہے۔۔۔ (بقیہ صفحہ: ۱۴ پر)

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

گوشہ خواتین

اسلام کی باکمال خواتین

حضرت اسماء بنت یزید بن سکن رضی اللہ عنہا

از: مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی*

نام اور کنیت

ان کا نام اسماءؓ، اور ام سلمہ کنیت، والد محترم کا نام یزید بن السکن تھا، ان کا تعلق اوس کے خاندان بنوعبد الاشہل سے تھا، حضرت سعد بن معاذؓ بھی اسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، حضرت سعد رشتہ میں ان کے چچا اور حضرت اسید بن حضیرؓ ان کے بھتیجے۔

قبول اسلام

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے اسی وقت مشرف بہ اسلام ہوگئیں، اور خود چند عورتوں کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ پر میرے ماں باپ قربان! میں مسلمان عورتوں کی طرف سے ایک پیغام لے کر آئی ہوں، خداوندا کریم نے حضور کو مرد و زن دونوں کی ہدایت کے لئے مبعوث فرمایا ہے، ہم حضور پر ایمان لائے ہیں، لیکن عورتوں اور مردوں کی حالت میں بڑا فرق ہوتا ہے، عورتیں گھروں کے اندر رہتی ہیں، اس لئے مردوں کی طرح نماز باجماعت، نماز جمعہ اور نماز جنازہ میں شریک نہیں ہوسکتیں اور نہ حج اور جہاد میں عمومیت سے حصہ لے سکتی ہیں، البتہ جب مرد باہر ہوتے ہیں تو عورتیں ان کی اولاد کی پرورش و پرداخت کرتی ہیں، ان کے مال کی حفاظت کرتی ہیں، اوران کے اہل وعیال کے پوشاک کے لئے کپڑا بنتی ہیں، کیا عورتوں کو بھی مردوں کے کارہائے خیر کا اجر وثواب ملے گا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس اس وقت بہت سے صحابہؓ موجود تھے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے مخاطب ہوکر فرمایا: کیا تم نے دین کے متعلق کسی عورت کو اس طرح گفتگو کرتے سنا ہے، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: عورت کے لئے شوہر کی رضا جوئی بہت ضروری ہے، اگر ایک عورت فرائض زوجیت ادا کرتی ہے اور شوہر کی اطاعت وفرماں برداری کرتی ہے تو اس کو بھی مرد کے برابر ثواب ملے گا، حضرت اسماءؓ اوران کے ساتھی

* رفیق دارالتصنیف والارشاد، واستاذ حدیث دارالعلوم دیودرگ

خواتین رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ ارشاد سن کر بہت خوش ہوئیں، حضرت اسماءؓ اس وقت اپنے ہاتھوں میں سونے کے کنگن پہنے ہوئے تھیں، حضور کی نظر پڑی تو حضور نے پوچھا: کیا ان کی زکوٰۃ دیتی ہو، حضرت اسماءؓ نے نفی میں جواب دیا تو فرمایا: کیا تم یہ پسند کرتی ہو کہ آخرت کے دن ان کے بدلے تمہیں آگ کے کنگن پہنائے جائیں، حضرت اسماءؓ نے کنگن اپنے ہاتھ سے فوراً اُتار دیئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! اگر ہم زیور نہ پہنیں تو شوہر کی نگاہ سے گر جائیں، حضور نے فرمایا: پھر چاندی کے زیورات بنواؤ اور ان پر زعفران مل دو کہ سونے کی چمک پیدا ہو جائے، اس کے بعد حضرت اسماءؓ نے دوسرے خواتین کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست اقدس پر شرف بیعت حاصل کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنا دست مبارک آگے بڑھانے کے لئے عرض کیا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں عورتوں سے ہاتھ نہیں ملاتا، البتہ تم ان باتوں کا اقرار کرو بیعت ہو جائے گی۔

(۱) اپنی اولاد کو قتل نہ کروگی۔ (۲) کسی پر جھوٹی تہمت نہ لگاؤ گی۔ (۳) چوری نہ کروگی۔ (۴) زنا سے بچوگی۔ (۵) کسی کو خدا کا شریک نہ بناؤ گی۔ (۶) اچھی باتوں سے انکار نہ کروگی۔

حضرت اسماءؓ اور دیگر خواتین نے صدق دل سے اس کا اقرار کیا، اور پھر خوشی خوشی اپنے گھر تشریف لے گئیں۔ (الطبقات الکبری لابن سعد: ۸/ ۴، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، مزید دیکھئے استیعاب فی معرفۃ الاصحاب، ابن عبد البر، ۵/ ۶ ۷ ۱۵ دار الجیل، بیروت)

حضرت اسماءؓ خدمت رسول میں

جب ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی رخصتی ہوئی تو اسماء نے چند دوسری خواتین کے ساتھ انہیں سنوارا اور انہیں حجرے میں بٹھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اطلاع دی، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے، کسی نے دودھ پیش کیا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تھوڑا نوش فرما کر باقی دودھ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو دیا تو انہوں مارے حیا کے سر جھکا لیا، حضرت اسماءؓ نے ڈانٹا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو دیتے ہیں لے لو، چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے وہ دودھ نوش فرمالیا۔ (مسند احمد) حضرت اسماء بنت یزید ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی سہیلی تھیں۔

(اسد الغابۃ: ۷/ ۱۷، دار الکتاب العلمیۃ، بیروت)

ایک دفعہ حضرت اسماء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اونٹنی کی مہار تھامے کھڑی تھیں کہ وحی نازل ہوئی، حضرت اسماءؓ فرماتی ہیں کہ اونٹنی اس وقت بوجھ تلے دبی جاتی تھی، ڈرنے لگیں کہ کہیں اس کی ٹانگیں نہ ٹوٹ جائیں۔

ایک مرتبہ درِ رسول میں حاضر ہوئیں، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دجال کا ذکر فرمایا: بڑی متأثر ہوئیں اور رونے لگیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اٹھ کر باہر تشریف لے گئے، کچھ دیر بعد دوبارہ تشریف لائے تو اسماءؓ کی شدت گریہ سے بدستور ہچکی بندھی ہوئی تھی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اتنا کیوں روتی ہو؟ حضرت اسماءؓ نے فرمایا:

یارسول اللہ! ﷺ ہم نے تو اتنی بھوک بھی برداشت نہیں کہ باندی اطمینان سے آٹا گوندھ کر روٹی پکالے، دجال کے عہد میں جو قحط ہوگا ہم اپنے ایمان پر کیسے ثابت قدم رہیں گے؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اس دن کثرت سے اللہ کا ذکر بھوک سے بچائے گا"۔ پھر نبی کریم ﷺ نے انہیں دلاسا دیا کہ رونے دھونے کی ضرورت نہیں، اس وقت تک میں زندہ رہوں گا تو مسلمانوں کی حفاظت کے خاطر اس کے سینہ سپر ہوجاؤں گا، اگر دجال کا ظہور میرے بعد ہو تو اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کی خود حفاظت کرے گا۔

غزوات میں شرکت

کئی ایک غزوات جن میں غزوہ خندق، خیبر، حدیبیہ اور بیعت رضوان شامل ہیں شرکت کی، زخموں کے علاج ومعالجہ اور ان کو پانی پلانے کی خدمت انجام دیتیں، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں یرموک کی ہولناک لڑائی پیش آئی تو شوق جہاد نے حضرت اسماء کو اپنے گھر بیٹھنے نہ دیا، وہ اپنے اہل خاندان کے ہمراہ اس لڑائی میں شرکت کے لئے حاضر ہوئیں اور بڑی پامردی اور ثابت قدمی کے ساتھ داد شجاعت دی، ایک موقع پر عیسائی مسلمانوں کو دباتے دباتے عورتوں کے خیمے تک پہنچ گئے، حضرت اسماء اور دوسری دختران اسلام خیموں کی چوبیں اکھاڑ کر دشمنوں پر ٹوٹ پڑیں، اوران کو پیچھے دھکیل دیا، اہل سیر نے لکھا ہے کہ اس لڑائی میں حضرت اسماء نے تن تنہا اپنی لکڑی سے نو رومیوں کو واصل جہنم کیا۔"قتلت یوم الیرموک تسعة من الروم بعمود فسطاطها" (معرفۃ الصحابہ لابن نعیم: ۶/۳۲۵۸، دارالوطن، الریاض)

حضرت اسماءؓ سے کئی ایک روایتیں منقول ہیں، جن کی تعداد تقریبا: ۸۱/احادیث بتلائی گئی ہے، جس کی وجہ سے ان کا نام کتب احادیث میں بکثرت ملتا ہے۔

وفات

حضرت اسماءؓ نے جنگ یرموک کے کئی سال بعد وفات پائی، ان کی قبر دمشق میں باب الصغیر کے پاس موجود ہے۔

تذکارِ صحابہؓ

سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ

از: مولانا عبدالرشید طلحہ نعمانی قاسمی*

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا شمار ان جلیل القدر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں ہوتا ہے جنہوں نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعلان نبوت کے بعد پہلے پہل اسلام قبول کیا، دین کی خاطر صعوبتوں کو برداشت کرتے ہوئے دو مرتبہ وطن عزیز کو خیر باد کہا اور زندگی کی آخری سانس تک مال و اسباب کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کی دل کھول کر اعانت و نصرت فرمائی۔ زندگی کے آخری ایام میں آپ کو اکثر یہ فکر دامن گیر رہتی تھی کہ اللہ نے مجھے جو اس قدر مال و دولت اور خوش حالی و فراوانی سے نواز رکھا ہے، کہیں ایسی بات تو نہیں کہ اللہ نے مجھے سب کچھ بس اسی عارضی و فانی دنیا میں ہی دے دیا ہو، اور وہاں آخرت کی ابدی و دائمی زندگی میں میرے لئے فقط محرومی ہو۔ یہ بات سوچ کر بہت زیادہ پریشان ہوجاتے، اکثر رقت طاری ہوجاتی اور پھر اللہ کی راہ میں مزید صدقہ وخیرات کرتے۔ یوں ''انفاق فی سبیل اللہ'' کا یہ سلسلہ آخری ایام میں بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔

نام ونسب:

آپ کا نام نامی: عبدالرحمٰن، کنیت: ابو محمد۔ والد کا نام: عوف اور والدہ کا نام شفا تھا۔ والدین میں سے ہر ایک کا تعلق زہری خاندان سے تھا۔ سلسلہ نسب کچھ اس طرح ہے: عبدالرحمٰن بن عوف بن عبد جوف بن عبد بن الحارث بن زہرہ بن کلاب بن مرہ القرشی الزہری۔

حلیہ مبارک:

آپ کی شخصیت باوقار اور وجیہ تھی، اونچا قد، گھنی زلفیں، خوب صورت چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں، سیاہ پلکیں، ستواں ناک، لمبی گردن، شفاف رنگت، ہتھیلیاں پر گوشت، قدرے باہر کی طرف نکلا ہوا سینہ۔ آپ نے کبھی خضاب کا استعمال نہیں کیا اور بڑھاپے کے آثار بھی آپ پر ظاہر نہیں ہوئے، ہمیشہ چہرے سے وجاہت ٹپکتی جو لوگوں کو مرعوب کر کے رکھ دیتی۔ (سیر الصحابہ ۲/ ۱۳۵)

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

اولاد وازواج:

حضرت عبد الرحمٰن ؓ نے مختلف اوقات میں متعدد شادیاں کیں، بیویوں کے ساتھ لطف ومحبت سے پیش آتے تھے، ایک انصاریہ سے شادی کی تو بیس ہزار دینار مہر میں دیے، بیویوں کے نام یہ ہیں: کلثوم بنت عتبہ بن ربیعہ، تماضر بنت الاصبغ ،کلثوم بنت عقبہ، سہلہ بنت عاصم، بحریہ بنت ہانی، سہلہ بنت سہیل، ام حکیم بنت قارظ، بنت ابی الخشخاش، اسماء بنت سلامہ، ام حریث، مجد بنت یزید، غزال بنت کسریٰ، زینب بنت الصباح۔

حضرت عبد الرحمٰن ؓ کی اولاد نہایت کثیر تھی، سالم، اسلام سے پہلے پیدا ہوئے اور پہلے ہی انتقال کر گئے، محمد، ابوسلمہ، ابراہیم، اسمٰعیل، حمید، زید، عمر، عدی، عروہ، اکبر، سالم اصغر، ابوبکر، عبد اللہ، عبد الرحمٰن، مصعب، سہیل، عثمان، عروہ، یحییٰ، بلال۔ صاحبزادیوں کے نام یہ ہیں: ام القم، یہ زمانہ جاہلیت ہی میں پیدا ہوئی تھی، حمیدہ امۃ الرحمن، صغریٰ، ام یحییٰ، جویریہ، امیہ، مریم۔

قبول اسلام:

عام روایات کے مطابق حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ واقعۂ فیل کے دسویں سال پیدا ہوئے، اس اعتبار سے جس وقت نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علمِ توحید بلند کیا اور لوگوں کو دین اسلام کی دعوت دی اس وقت آپ کی عمر تیس سال سے متجاوز تھی۔ فطری عفت و پاک بازی کے سبب شراب سے پہلے ہی تائب ہو چکے تھے پھر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی رہنمائی سے جادۂ حق بھی صاف نظر آرہا تھا؛ چناں چہ بارگاہ نبوت میں حاضر ہوکر رہروان حق کے قافلہ میں شامل ہو گئے، اس وقت تک صرف چند روشن ضمیر مقبولِ خاص حضرات کو اس کی توفیق ارزانی ہوئی تھی۔ (عشرۂ مبشرہ بہ حوالہ طبقات ابن سعد، قسم اول، جزو ثالث)

ہجرت حبشہ ومدینہ:

دولت ایمان سے مشرف ہونے کے بعد حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو بھی دیگر صحابہ کرام ؓ کی طرح جلاوطن ہونا پڑا۔ آپ سب سے پہلے ہجرت کر کے حبشہ تشریف لے گئے پھر وہاں سے واپس آئے تو سب کے ساتھ سرزمین مدینہ طیبہ نکل پڑے، اس طرح حبشہ اور مدینہ دونوں مقامات کی طرف ہجرت کرنے کا شرف آپ کے حصے میں آیا۔

مواخات:

مدینہ پہنچنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت سعد بن الربیع انصاری ؓ سے آپ کا بھائی چارہ کرادیا،

حضرت سعد انصار میں سب سے زیادہ مال دار اور فیاض آدمی تھے، مواخات کے بعد کہنے لگے: میں اپنا نصف مال تمہیں دے دیتا ہوں، اسی طرح میری دو بیویوں میں سے جو تمہیں پسند ہو میں اسے طلاق دے دوں گا پھر تم نکاح کر لینا۔ حضرت عبد الرحمٰنؓ کی غیرت نے اسے گوارا نہیں کیا، اس پیش کش کے جواب میں فرمانے لگے: خدا تمہارے مال و منال اور اہل وعیال میں برکت عطا فرمائے، آپ مجھے صرف بازار کا راستہ دکھا دیں! لوگوں نے بنی قینقاع کے بازار میں پہونچا دیا۔ وہاں سے واپس آئے تو کچھ گھی پنیر وغیرہ نفع میں بچا لائے اور دوسرے روز باقاعدہ تجارت شروع کر دی، یہاں تک کہ مال دار ہو گئے۔ چند دن بعد بارگاہ نبوت میں حاضر ہوئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے کپڑوں پر زرد رنگ کا اثر دیکھا تو فرمایا ''یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا، میں نے ایک انصاریہ سے نکاح کر لیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا! اللہ تمہیں برکت دے، اب ولیمہ کرو، اگرچہ ایک بکری ہی کے ذریعے کیوں نہ ہو۔ (بخاری)

غزوات میں شرکت:

سن دو ہجری سے غزوات کا سلسلہ شروع ہوا، حضرت عبد الرحمٰن اکثر معرکوں میں جرأت و بہادری کے ساتھ شریک رہے اور شجاعت و بسالت کے وہ جوہر دکھائے کہ تاریخ انہیں فراموش نہیں کر سکتی۔ غزوۂ بدر میں آپ ہی نے دو انصاری جوانوں کو ابوجہل کا پتہ بتایا جس کے نتیجے میں وہ جہنم واصل ہوا۔ غزوۂ احد میں آپ پوری جاں بازی کے ساتھ اس طرح لڑتے رہے کہ زخموں سے چور ہو گئے، جنگ کے بعد جسم مبارک پر بیس سے زائد آثار جراحت شمار کیے گئے بالخصوص پاؤں پر ایسے کاری زخم تھے کہ صحت کے بعد بھی ہمیشہ لنگڑا کر چلتے تھے۔ (سیرت ابن ہشام)

غزوۂ تبوک کے موقع پر مسلمانوں کو بہت سے مسائل درپیش تھے، بالخصوص مالی تنگی کے سبب مجاہدین کی ضروریات کو پورا کرنا مشکل ہو گیا تھا، مدینہ میں بھی قحط کا زمانہ تھا۔ کئی مجاہدین صرف اس لیے واپس کر دیے گئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس انہیں دینے کے لیے سواریاں میسر نہ تھیں۔ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو حکم دیا کہ وہ اللہ کی راہ میں خرچ کریں اور اس کا بدلہ و ثواب اللہ ہی سے پانے کی نیت کریں۔ مسلمانوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم پر لبیک کہتے ہوئے خوب مال خرچ کیا۔ اس موقع پر حضرت عبد الرحمٰنؓ بن عوف بھی خرچ کرنے والوں میں سرفہرست تھے۔ انہوں نے دو سو اوقیہ (ایک اوقیہ ساڑھے دس تولہ کے برابر ہے) بارگاہِ رسالت میں پیش کیے۔

شعبان سن چھ ہجری میں دومۃ الجندل کی مہم پر مامور ہوئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بلا کر اپنے دستِ اقدس سے عمامہ باندھا پیچھے شملہ چھوڑا، اور ہاتھ میں علم دے کر فرمایا، بسم اللہ راہِ خدا میں روانہ ہو جاؤ، جو لوگ خدا کی نافرمانی وعصیان میں مبتلا ہیں ان سے جا کر جہاد کرو؛ لیکن کسی کو دھوکا نہ دینا فریب نہ کرنا، بچوں کو نہ مارنا، یہاں تک کہ دومۃ الجندل پہنچ کر قبیلہ کلب کو اسلام کی دعوت دینا، اگر وہ قبول کریں تو ان کے بادشاہ کی لڑکی سے نکاح کر لینا۔ حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ اس اعزاز کے ساتھ مدینہ سے روانہ ہوکر دومۃ الجندل پہنچے اور تین دن تک دعوت وتبلیغ اسلام کا فرض اس خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے کہ قبیلہ کلب کے سردار صبغ بن عمرو الکلبی جو مذہباً عیسائی تھے اور اس کی قوم کے بہت سے لوگ بہ طیب خاطر دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے، البتہ بعضوں نے جن کو اس کی توفیق نہ ہوئی جزیہ منظور کر لیا۔

اسی طرح فتح مکہ کے بعد حجۃ الوداع تک جس قدر مہمات اور جنگیں پیش آئیں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سب میں شریک رہے نیز نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد جب سقیفۂ بنی ساعدہ میں کچھ اختلاف سا رونما ہوا تو آپ بھی ان لوگوں میں سرفہرست تھے جو اس گتھی کو سلجھانے میں شریک رہے، اس وقت حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دست حق پرست پر اولین بیعت کرنے والوں میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔

عہد صدیقی وفاروقی میں:

خلیفۂ اول کے عہد میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ ایک مخلص مشیر اور صائب الرائے رکن کی حیثیت سے ہر قسم کے مشوروں میں شریک رہے۔ سن تیرہ ہجری میں جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ علالت کے سبب زندگی کے آخری ایام گزار رہے تھے تو انہیں یہ فکر دامن گیر تھی کہ ان کے بعد منصب خلافت کی ذمہ داری کون سنبھالے گا؟ اس حوالے سے مشورے کے لیے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو طلب کیا اور اس منصب عظیم کے لیے فاروق اعظم کا نام پیش کر کے مشورہ چاہا، حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے پوری آزادی اور خلوص کے ساتھ مشورہ دیا کہ عمر کی اہلیت میں کیا شک ہوسکتا ہے؟ بس ذرا مزاج میں سختی ہے۔ حضرت ابوبکر نے کہا کہ ان کی سختی اس لیے تھی کہ میں تھوڑا نرم تھا، جب خلافت کا بار گراں ان کے سر پر ہوگا تو وہ خود بخود نرم ہو جائیں گے۔ (طبری)

غرض کچھ دن بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ داعی اجل کو لبیک کہہ گئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خلافت کی کمان سنبھالی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے نظام خلافت کو منظم و مستحکم کرنے کے لیے جب مجلس شوریٰ قائم کی تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اس کے مؤقر اور سرگرم رکن تھے، بہت سے معاملات میں آپ ہی کی رائے پر

فیصلے کیے گئے جو نتیجہ خیز ثابت ہوئے اور سب نے آپ کی ذہانت ودوراندیشی کا اعتراف کیا۔

وفات:

سن ۳۲ ہجری میں ۷۵ سال کی عمر میں مدینہ منورہ میں آپ کی وفات ہوئی۔خلیفۂ وقت امیر المؤمنین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ،حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ،حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اور دیگر متعدد کبارِ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے مل کر تجہیز وتکفین کے فرائض انجام دیے،نمازِ جنازہ ان کی وصیت کے مطابق خلیفۂ وقت حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے پڑھائی اور پھر مدینہ منورہ کے قبرستان ''بقیع''میں سپردِ خاک کر دیا۔

یوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے یہ انتہائی عظیم المرتبت اور جلیل القدر صحابی حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ مالکِ حقیقی سے جا ملے۔

(بقیہ صفحہ ۲۷ سے)

''اے اللہ ہم تیرے عاجز، کمزور اور ناتواں بندے ہیں،ہم امتحان وآ زمائش کے قابل نہیں، ہم صرف تیرے رحم وکرم کے محتاج ہیں،اس لیے قرآن مجید میں بندوں کو دعا سکھائی گئی کہ رَبَّنَا لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ (سورۃ البقرۃ:۲۸۶)(اے ہمارے پروردگار ہم پر ایسا بار نہ ڈال جس کو سہنے کی ہم میں طاقت نہیں) اس کے علاوہ قرآن مجید میں جلیل القدر پیغمبر حضرت ایوب علیہ السلام جن کا صبر ضرب المثل ہے،ان کی دعا کا ذکر ہے:رَبِّ اِنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ (الانبیاء:۸۳)(اے میرے پروردگار! مجھے تکلیف پہنچی ہے اور آپ تمام رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحم کرنے والے ہیں)ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے سوال کیا گیا کہ دعا میں کیا مانگا جائے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا سَلُوا اللهَ الْعَافِيَةَ اللہ سے عافیت مانگو، عافیت یہ ہے کہ آدمی کی زندگی صحت وتندرستی، خیروبرکت کی روزی، عزت وسربلندی اور دین وایمان کی سلامتی سے آباد وشاد رہے،غرض یہ کہ مصائب ومشکلات کے موقع پر سلف صالحین کے صبر اور تسلیم ورضاء کے یہ واقعات بندۂ مومن کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ ۔

مالک تری رضاء رہے اور تو ہی تو رہے
باقی نہ میں رہوں نہ میری آرزو رہے

اصلاحی مضامین

صبر و شکر سے متعلق سلف صالحین کے سبق آموز واقعات

مولانا محمد انصار اللہ قاسمی *

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی میں تمہارے لئے زندگی گذارنے کا بہترین نمونہ موجود ہے، لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب:۲۱) یہ بات اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں بھی فرمائی کہ ابراہیم اور اُن کے صاحبِ ایمان ساتھ ساتھیوں کے حالات تمہارے لئے ''اسوۂ حسنہ'' ہیں، قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ (الممتحنۃ:۴) آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے لئے نمونہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہم زندگی کے مختلف مراحل اور معاملات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کو پیشِ نظر رکھیں، زندگی میں سرد گرم حالات حضرات انبیاء کرام اور ان کے بلند کردار ساتھیوں کو بھی پیش آئے، انھوں نے مصائب ومشکلات میں صبر کا دامن تھامے رکھا اور تسلیم و رضاء کے پیکر بنے رہے، پھر اسلامی تاریخ میں ہر دور کے سلفِ صالحین اللہ کے نیک بندوں، انبیاء کرام کے سچے پیروکاروں نے امتحان وآزمائش کے موقع پر صبر وتحمل کا عملی نمونہ پیش کیا، تاکہ بعد میں آنے والے ان کے واقعات سے سبق حاصل کریں۔

چنانچہ زندگی کے مختلف مراحل میں صبر وشکر اور تسلیم و رضاء سے متعلق سلف صالحین کے سبق آموز واقعات بھی ہیں، جو بیماری اور پریشانی کے موقع پر اجر وثواب سے متعلق احادیث پر ہمارے ایمان ویقین میں اضافہ کرتے ہیں، چند ایک واقعات ملاحظہ ہوں:

۱) حضرت عبد اللہ بن محمد جہادی مہم کے سلسلے میں مصر کے ایک ساحلی علاقہ میں مقیم تھے، ایک مرتبہ ٹہلتے ٹہلتے ساحل سمندر پر پہنچے، وہاں ایک خیمہ میں دیکھا کہ ہاتھ پاؤں سے معذور اور آنکھوں کی بینائی سے محروم ایک شخص پڑا ہے اور با آواز بلند کہہ رہا ہے:

''میرے رب! مجھے اپنی نعمتوں پر شکر کی توفیق عطا فرما، مجھے تو نے اپنی مخلوق میں سے بہت سوں پر فضیلت اور فوقیت بخشی ہے، اس فوقیت پر مجھے اپنی حمد وثناء کی توفیق عطا فرما۔''

* آرگنائیزر مجلس تحفظ ختم نبوت ٹرسٹ تلنگانہ

حضرت عبداللہ کو معذور شخص کی اس دعا پر بڑی حیرت اور تعجب ہوا کہ ہاتھ پیر سے معذور اور بینائی سے محروم ہے، جسم میں زندگی کی تازگی کا کوئی اثر نہیں ہے پھر بھی اللہ کی حمد وثناء اور شکر گذاری میں مصروف ہے، چنانچہ وہ قریب آئے اور پوچھا کہ: محترم! آپ اللہ تعالیٰ کی کس نعمت پر شکر گذار ہیں؟ اس پر معذور شخص نے کہا:

''آپ کو کیا معلوم میرے رب کا میرے ساتھ کیا معاملہ ہے، بخدا اگر وہ آسمان سے آگ برسا کر مجھے راکھ کر دے، پہاڑوں کو حکم دے کہ مجھے کچل دے، سمندروں کو مجھے غرق کرنے کے لیے کہہ دے اور زمین کو مجھے نگلنے کا حکم دے تو میں کیا کر سکتا ہوں، میرے ناتواں جسم میں زبان کی بے بہا نعمت کو دیکھئے کہ یہ سالم ہے، کیا صرف اس زبان کی نعمت کا میں زندگی بھر شکر ادا کر سکتا ہوں۔''

اس کے بعد معذور شخص نے حضرت عبداللہ سے اپنے خدمت گذار، گم شدہ بیٹے کا پتہ لگانے کی گذارش کی، ایسے صابر وشاکر بندہ کی خدمت کو سعادت سمجھ کر عبداللہ بن محمد نے جنگل میں گمشدہ لڑکے کی تلاش شروع کر دی، اچانک وہ یہ دردناک منظر دیکھتے ہیں کہ اللہ کے اس صابر وشاکر بندہ کے گمشدہ لڑکے کی لاش مٹی کے دو تودوں کے درمیان بے گور وکفن پڑی ہوئی ہے جس کو جگہ جگہ سے درندوں اور پرندوں نے نوچ کھا رکھا ہے، عبداللہ کے آنسو بھر آئے، وہ پریشان اور حیران ہوئے کہ کیسے معذور شخص کو اس کے بیٹے کی وحشت ناک موت کی خبر دیں، آخر بڑی مشکل سے لمبی چوڑی تمہید باندھنے کے بعد انھوں نے اس کو یہ المناک خبر سنائی، اس پر اللہ کے اس شاکر وصابر بندہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ پڑے، دل پر غموں کے بادل چھا جاتے ہیں تو آنکھوں سے اشکوں کی برسات شروع ہو جاتی ہے، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے کہ غم کا غبار اشکوں میں ڈھل کر نکل جاتا ہے، بیٹے کی موت پر شکوہ شکایت کرنے کے بجائے معذور شخص یوں گویا ہوئے:

حمد وستائش اس ذات کے لیے ہے جس نے میری اولاد کو اپنا نافرمان نہیں پیدا کیا، اور اسے جہنم کا ایندھن بننے سے بچایا، پھر انا للہ...... پڑھا اور ایک چیخ کے ساتھ اللہ کے اس نیک بندہ کی روح پرواز کر گئی......

اب ہمیں کیا ستائیں گے دوراں کی گردشیں
اب ہم حدود سوز زیاں سے نکل گئے

معذور شخص کی اس اچانک موت پر عبداللہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے پھر انھیں معلوم ہوا کہ یہ معذور شخص کوئی اور نہیں بلکہ وقت کے بلند پایۂ مشہور محدث حضرت ابوقلابہ ہیں جو حضرت ابن عباس ؓ کے شاگرد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سچے عاشق تھے، آپ صبر واستقامت کے پیکر اور تسلیم ورضاء کے خوگر تھے، تجہیز وتکفین کے بعد حضرت عبداللہ نے انہیں خواب میں دیکھا کہ وہ جنت کے باغات میں سیر وتفریح کر رہے ہیں، جنت کا

لباس زیب تن کیے ہوئے ہیں، اور یہ آیت تلاوت کررہے ہیں: سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ (سورۃ الرعد:۲۴) صبر کرنے کے سبب تم پر سلامتی ہو اور آخرت کا گھر بہترین ٹھکانہ ہے، حضرت عبداللہ نے پوچھا کیا آپ وہی معذور شخص ہیں؟ فرمانے لگے:

''جی ہاں! میں وہی شخص ہوں اللہ تعالیٰ کے یہاں چند بلند مراتب اور درجات ایسے ہیں جن تک رسائی مصیبت میں صبر راحت میں شکر اور جلوت وخلوت میں خوف خدا کے بغیر ممکن نہیں، اللہ تعالیٰ نے اسی صبر وشکر کی بدولت مجھے ان نعمتوں سے سرفراز فرمایا'' (کتابوں کی درس گاہیں، ص:۳۹ تا ۴۱ مؤلف ابن الحسن عباسی)

۲) حضرت عروہ ابن زبیرؒ مشہور تابعی ہیں، دوران سفر پیر کو چوٹ لگنے سے پاؤں زخمی ہوگیا، تکلیف کی شدت بے انتہا تھی، طبیبوں کی رائے یہ ٹھہری کہ پاؤں کاٹنا ضروری ہے، حضرت عروہ ابن زبیرؒ نے اس کو منظور فرمالیا، مگر پاؤں کاٹنے سے پہلے بے ہوشی کے لیے نشیلی دوا کے استعمال سے انکار کردیا اور فرمایا کہ میں کوئی لمحہ اللہ کی یاد سے غفلت میں نہیں گذار سکتا، بہر حال ہوش وحواس کی حالت میں آرا گرم کرکے آپ کا پیر کاٹا گیا، اس دوران آپ نے کسی تکلیف کا اظہار نہیں کیا، پھر اپنا کٹا ہوا پاؤں سامنے رکھ کر فرمایا ''کیا غم ہے اگر مجھے ایک عضو کے بارے میں آزمائش میں ڈال کر باقی اعضاء کے سلسلہ میں امتحان سے بچالیا گیا'' ابھی آپ یہ کہہ ہی پائے تھے کہ خبر ملی آپ کا ایک بیٹا چھت سے گر کر انتقال کرگیا ہے آپ نے اناللہ وانا الیہ راجعون پڑھی اور فرمایا ''اللہ تیرا شکر ہے کہ تونے ایک جان لی اور کئی جانوں کو سلامت رکھا'' یعنی باقی بیٹے باحیات تھے۔

(ملخص حوالہ سابق، ص:۴۳)

۳) حضرت عمران بن حصینؓ صحابی رسول ہیں، بدن میں ایک ناسور پھوڑے کے پھٹنے سے ۳۲/ برس صرف چت لیٹے رہے، کروٹ نہیں لے سکتے تھے، کھانا پینا، عبادت کرنا اور قضاء حاجت کرنا وغیرہ سب کچھ ایک ہی حالت میں ہوتا تھا، اتنی سخت اور لمبی بیماری میں بھی آپ بالکل ہشاش بشاش رہتے تھے، چہرہ پر کسی تکلیف و پریشانی کے آثار نہیں ہوتے، لوگوں نے حیرت وتعجب سے عرض کیا کہ حضرت! اتنی شدید اور طویل بیماری میں آپ کے چہرہ پر جو بشاشت اور تازگی ہے وہ کسی صحت منداور تندرست کو بھی نصیب نہیں، آخر اس کی وجہ؟ حضرت عمران بن حصینؓ فرماتے ہیں: ''میں نے بیماری پر صبر کیا، اس کو بھی اللہ کا عطیہ سمجھا اور اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر راضی رہ کر یہ سمجھا کہ میرے لیے اللہ کی مصلحت یہی ہے، اس صبر کرنے کا پھل اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ دیا کہ میں اپنے بستر پر روزانہ فرشتوں سے مصافحہ کرتا ہوں، مجھے عالم غیب کی زیارت ہوتی ہے، عالم غیب میرے اوپر کھلا ہوا ہے۔'' (ملخص بکھرے موتی ۲/ ۱۶۳ مؤلف مولانا یونس پالن پوری)

جنت اور اس کے باغات عالم غیب سے تعلق رکھتے ہیں، عالم غیب کی زیارت اور اس کا کھلا ہونے کے معنی یہ ہے کہ صحابیٔ رسول دنیا ہی میں جنت کے باغات اور اس کے خوبصورت وخوشنما مناظر سے لطف اندوز ہورہے ہیں، تب ہی تو آپؓ کے چہرہ پر اتنی بشاشت اور تازگی ہے، مولانا محمد علی جوہر نے بہت خوب کہا ؎

ہر رنگ میں راضی برضا ہونے کا تو مزہ دیکھ
دنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنت کی فضاء دیکھ

۴) مولانا محمد علی جوہر کا یہ شعر ''جگ بیتی'' نہیں خود شاعر کی ''آپ بیتی'' ہے، ہوا یوں کہ آپؒ آزادیٔ وطن کی جدوجہد میں گھر سے میلوں دور جیل کی سزا کاٹ رہے تھے، اطلاع ملی کہ آپ کی چہیتی اور لاڈلی دوسری بیٹی آمنہ دق کی بیماری میں مبتلا ہے، فطری طور پر آپ کو اس کا صدمہ اور غم ہوا لیکن اس موقع پر آپ کے کہے گئے اشعار جذبۂ صبر اور تسلیم ورضا کی اعلیٰ مثال ہیں، فرماتے ہیں:

میں ہوں مجبور اللہ تو مجبور نہیں
تجھ سے میں دور سہی وہ تو مگر دور نہیں
امتحان سخت سہی پر دل مؤمن ہی وہ کیا
جو ہر اک حال میں امید سے معمور نہیں
تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اس کو
نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

تسلیم ورضاء کے ان جذبات کے بعد آخر میں اپنی عاجزی اور بندگی کا یوں اظہار کرتے ہیں:

تیری قدرت سے خدایا تری رحمت نہیں کم
آمنہ بھی جو شفا پائے تو کچھ دور نہیں
میری اولاد کو بھی مجھ سے ملادے یارب
تو ہی کہہ دے تری رحمت کا یہ دستور نہیں

(ملخص، محمد علی ذاتی ڈائری کے چند اوراق ص: ۱۱۷/از مولانا عبدالماجد دریابادیؒ)

مصائب وپریشانیوں میں صبر واستقامت کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ آدمی ایسے مواقع پر ''دعا اور دوا'' سے بالکل غافل اور بے پروا ہوجائے، بیماری اور پریشانی میں بارگاہِ الٰہی میں دعا وگریہ وزاری اور اسباب کے درجہ میں علاج کی تدبیر وکوشش دراصل اپنی بے بسی، بے چارگی، عاجزی اور بندگی کا اظہار ہے، دعا اور علاج درحقیقت خدا تعالیٰ کے حضور اس بات کا اقرار ہے کہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ (بقیہ صفحہ ۲۳ پر)

گوشۂ آزادی

جنگ آزادی میں علماء کرام کی خدمات

اور ہماری ذمہ داریاں

از: مولانا تبریز عالم قاسمی*

اٹھارہویں صدی کے وسط میں سلطنت مغلیہ کا آفتاب مائل بہ غروب تھا اور انگریزی اقتدار کی گھٹائیں دن بہ دن تیز ہورہی تھیں، انگریز جب ہندوستان پہنچے تھے تو تاجروں کی حیثیت سے پہنچے تھے اور عام لوگوں نے انھیں ایک معمولی تاجر کے سوا اور کچھ نہیں سمجھا؛ لیکن ان کی نیت صاف نہیں تھی، انھوں نے اپنوں کی کمزوری اور آپسی نااتفاقی سے فائدہ اٹھا کر اپنی شاطرانہ اور عیارانہ چالوں کے ذریعہ یہاں کے سیاہ وسفید کے مالک ہوگئے اور ہندوستانی قوم کو غلامی کی غیر مرئی زنجیروں میں قید کرنے میں کامیاب ہوگئے، یہاں کی دولت وثروت کو بے دریغ لوٹنے لگے، یہاں کے باشندوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑنے لگے اور یہاں کی تہذیب سے کھلواڑ کرنے لگے اور اس کا سلسلہ مزید بڑھتا ہی گیا، پانی جب سر سے اوپر ہوگیا، تو ہندوستانیوں کے دلوں میں آزادئ وطن کا جذبہ پیدا ہوا اور سب سے پہلے مسلمانوں نے اس خطرے کی سنگینی کو محسوس کیا، سراج الدولہ اور سلطان ٹیپو شہید اور دیگر مسلم فرماں روا اپنی تمام تر قوتوں کے ساتھ جان ہتھیلی پر رکھ کر میدانِ جنگ میں کود پڑے اور یوں تحریک آزادی کی ابتداء ہوئی پھر یہ تحریک رکی نہیں بلکہ اس نے زور پکڑنا شروع کیا اور اب علماء ہند کفن باندھ کر انگریزوں کو للکارنے لگے اور یہ ایسی جماعت تھی جس کی جفاکشی عزائم وہمم، صبر آزمائی، دوراندیشی اور ایثار وقربانی نے اس دور کی تاریخ کو انقلاب آفریں بنادیا اور مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی، مولانا اسمٰعیل شہید، مولانا عبدالحئی رحمہم اللہ اور آگے چل کر علماء دیوبند، مولانا قاسم نانوتوی، مولانا گنگوہی، حافظ ضامن شہید، حضرت شیخ الہند، مولانا حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ اور مولانا آزاد رحمہم اللہ جیسے پیکرِ استقلال اور کوہِ گراں پیدا ہوئے، جنھوں نے اپنی تقریروں، تحریروں؛ بلکہ اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرکے آزادئ وطن کی بنیاد رکھی۔

علماء کرام کی جلائی ہوئی مشعل کی روشنی میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی بہادر شاہ ظفر کی قیادت میں لڑی گئی جس میں ہندوستان کے ہر فرقے کے لوگ شامل تھے؛ لیکن یہ جنگ ناکام ہوئی اور ناکامی کی قیمت سب سے

* استاذ شعبہ عالمیت دارالعلوم حیدرآباد

زیادہ مسلمانوں کو چکانی پڑی، تقریباً دولاکھ مسلمان شہید ہوگئے جن میں تقریباً باون ہزار علماء تھے ان کی جائدادیں لوٹ لی گئیں، اس قدر جانی و مالی نقصان کے باوجود تحریک آزادی کا سلسلہ مختلف شکلوں میں جاری رہا اور بالآخر ہمارا ملک تمام فرقوں، بالخصوص مسلمانوں اور خاص طور سے علماء کی جہد مسلسل اور پیہم کوشش اور جانی و مالی قربانی کے بعد ۱۵ / اگست ۱۹۴۷ء کو آزاد ہوگیا، اور ۲۶ / جنوری ۱۹۵۰ء سے جمہوری ملک قرار دیا گیا اور دستور کو سیکولر دستور کا نام دیا گیا۔

مجاہدین آزادی کے سامنے تحریک آزادی کا مقصد صرف سیاسی آزادی نہیں تھا؛ بلکہ ایسے نظام حکومت کا خواب تھا، جس میں اس ملک کے تمام شہریوں کو مذہبی، سماجی اور اقتصادی آزادی حاصل ہو؛ تاکہ بغیر کسی مذہبی علاقائی اور لسانی تفریق کے سماجی نابرابری، جہالت، غربت، ظلم وتشدد اور فرقہ وارانہ تعصّبات سے بری سماج وجود میں آسکے اور ہر شہری آبرومندانہ زندگی گذار سکے، غور کیجیے ملک آزاد ہوئے تقریباً ۷۵ / سال ہو گئے؛ لیکن کیا انگریزوں کے چلے جانے کے بعد ہمارے معاشرے کو انگریزی تہذیب وتمدن سے آزادی مل سکی، ۱۹۴۷ء میں ملک کے لوگوں کے درمیان مل جل کر رہنے کا جو سمجھوتہ ہوا تھا کیا وہ کامیاب ہوتا ہوا نظر آرہا ہے، کیا سماجی نابرابری کی خلیج پاٹ دی گئی، کیا ہر مذہب والے کو مذہبی آزادی مل سکی؟ بدعنوانی، کرپشن، سرکاری خزانے کی لوٹ، اشیاء خوردونوش میں ملاوٹ، دہشت گردی وفرقہ پرستی جیسی غیر قانونی باتوں سے ملک آزاد ہوسکا؟ ذرا آگے بڑھیے، آزادی کے بعد ایک مخصوص فرقے کے اردگرد گھیرا تنگ کیا جانے لگا، گزشتہ ۵۰ / ۶۰ / سالوں میں ملک کی سب سے بڑی اقلیت کے ساتھ جو امتیازی سلوک کیا گیا اس کے نتیجے میں جمہوریت پر اعتماد برقرار نہ رہا، اس دوران ملک کا اخلاقی زوال اس سطح تک پہنچ گیا کہ ملک کے ہر محکمہ اور ملک کے ہر ادارے میں بے ایمانی، رشوت خوری اور ناجائز طریقے سے دولت سمیٹنے کا طوفان سا آگیا، اب ہر روز ایک نئی بدعنوانی کا پردہ فاش ہورہا ہے، سیاست ایک نفع بخش پیشہ بن گئی، ملک کی فوج کے کچھ افراد شک کے دائرے میں آگئے، محب وطن کو غدار وطن کہا جانے لگا، مسلمانوں کے ساتھ ہر سطح پر اور تمام شعبہ ہائے حیات میں ناانصافی کی گئی، تعلیمی اور اقتصادی طور سے انھیں قعر مذلت میں ڈھکیل دیا گیا، ۱۹۶۱ء سے فسادات کا سلسلہ چل پڑا، جانی و مالی دونوں اعتبار سے انھیں نقصان پہنچایا گیا، فاشسٹ تنظیموں اور سیکوریٹی فورسز کو کھلی چھوٹ مل گئی کہ وہ مسلمانوں کے خون میں آزادی سے ہاتھ رنگا کریں، دہشت گردی کے نام پر بے قصور مسلمانوں کو سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا گیا، ان کی عبادت گاہوں کو نشانہ بنایا گیا، فرضی انکاؤنٹر کا کھیل کھیلا گیا، غرضیکہ ہر میدان میں ایک مخصوص فرقے کو پیچھے رکھنے کی سازشیں کی گئیں، کیا مجاہدین آزادی نے ایسی ہی جمہوریت کا خواب اپنی آنکھوں میں سجایا تھا؟

دوسری طرف جاں باز اور ایثار شیوہ علماء اور مجاہدینِ آزادی کی خدمات اوران کی سرفروشی کے آثار ونشانات تاریخ کے اوراق سے مٹانے کی انتھک کوشش جاری ہیں اور یہ باور کرایا جارہا ہے کہ ملک کی آزادی میں مسلمانوں کا کوئی خاص رول نہیں ہے اور جشن آزادی اور جشن جمہوریہ کے موقع پر صرف گاندھی، نہرو، سبھاش چندربوس، بھگت سنگھ وغیرہ کا نام پوری طاقت سے لیا جاتا ہے، اور ہماری نئی نسل ان کے دام فریب میں پھنس بھی رہی ہے، آج ہماری نسل اپنے بزرگوں اور آباء واجداد کی قربانیوں کی تاریخ سے ناواقف ہے، انھیں علماء دیوبند کی جفاکشی، علماء صادق پور کی سرفروشی کا علم نہیں، انھیں سراج الدولہ، شیر میسور ٹیپو سلطان کی وطن پرستی سے واقفیت نہیں، آج نئی نسل چاہے وہ مسلمان ہوں یا برادران وطن سب یہ سمجھتے ہیں کہ ۲۶ / جنوری اور ۱۵ / اگست ہماری قومی تاریخ میں مسرت کے دنوں میں سے ایک دن ہے، اس میں شک نہیں کہ واقعی یہ دن فرحت وشادمانی کے دن ہیں؟ لیکن ہم نئی نسل پر یہ بھی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ہم اپنے اکابر واسلاف کی قربانیوں کی تاریخ پڑھیں، ان کی حیات وخدمات کا جائزہ لیں، ان کی صفات وخصوصیات اپنے اندر جذب کرکے اس کے نقش قدم پر چلنے کا حوصلہ پیدا کریں اور برادران وطن کو علماء اور مسلمان مجاہدین کی وطن پرستی، اور وطن کے لیے جذبہ صادق اور تڑپ سے روشناس کرائیں، انھیں بتائیں کہ اگر آزادی وطن کی تاریخ سے علماء کرام کی خدمات کو نکال دیا جائے تو تاریخ آزادی کی روح ختم ہوجائے گی، علماء کرام کے کردار کیسے تھے، محمد میاں صاحب کی زبانی سنیے لکھتے ہیں:

”البتہ اسی اغراض پرستی اور طوائف الملوکی کے دور میں تحقیق وتفتیش کی ندرت آفرینی اور تلاش وجستجو کی عجائب نوازی، ہمیں ایک جماعت سے روشناس کراتی ہے، جس کے جذبات مقدس، مقاصد بلند اور جس کی جدوجہد ہر قسم کے شبہ سے پاک ہے، بادشاہوں، شاہزادوں، نوابوں اور راجاؤں کے متعلق بجا طور پر جاگیر شاہی کی زریں تمناؤں کا شبہ کیا جاسکتا ہے؛ لیکن اس جماعت کا دامن ایسے تمام داغوں سے پاک ہے یہ جماعت نہ اقتدار کی، نہ حکومت وسلطنت کی آرزومند، نہ اعزاز واکرام اور اعلی خطابات کی ہوس اس کے دامنوں سے الجھی ہوئی، اس کے سامنے صرف وطن ہے، باشندگان وطن ہیں، وطن عزیز کی حفاظت، اہل وطن کی ہمدردی اور اپنے ملک کی تعمیر وترقی ہے یہی ان کا نصب العین ہے، اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے اس دین ومذہب کی حفاظت بھی ضروری سمجھتے ہیں، جس سے ان کے پاک نفوس میں یہ پاکیزہ جذبات پیدا کیے“ یہ علماء ہند کی جماعت ہے“ وہ جماعت کہ اگر اس کے فکر سلیم اور جذبہ صادق کا اعتراف نہ کیا جائے، اور اگر تاریخی واقعات کی ترتیب اوران کے سلسلہ میں سے اس جماعت کی سنہری زنجیر کو نکال دیا جائے تو نہ صرف یہ کہ با اخلاص اور ایثار شیوہ

جماعت کے حق میں ناانصافی ہوگی؛ بلکہ حق یہ ہے کہ وطن عزیز کے حق میں خیانت اور ایثار وقربانی کو پوری تاریخ پر ایک بہت بڑا ظلم ہوگا اس جماعت نے اٹھارہویں صدی کے وسط سے رفتار زمانہ کو بھانپ کر جونظریہ مرتب کیا وطن عزیز کی ترقی اور کامیابی کے لیے جو تدبیریں سوچیں اور جس طرح ان پر عمل کیا وہ ایک ناقابل فراموش حقیقت ہے" (علماء ہند کا شاندار ماضی: ۵۷)

مسلمان اور علماء آزادی وطن کی لڑائی میں دوسروں کے ساتھ برابر کے شریک رہے ہیں اس کا انکار ناممکن ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم تحریر وتقریر کے ذریعہ تقاریب و پروگراموں کے توسط سے لوگوں کو روشناس کرائیں اس کے لیے ایک مضبوط مسلم سیاسی قیادت کی بھی ضرورت معلوم ہوتی ہے، جس کے لیے سارے آپسی اختلافات مٹانے ہوں گے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں مشہور کالم نگار برائے راشٹریہ سہارا محفوظ الرحمان مرحوم کی تحریر کا اقتباس نقل کر کے مضمون ختم کیا جائے۔

"اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ موجودہ حالات میں ایک مضبوط قیادت ہی مسلمانوں کے درد کا درماں بن سکتی ہے، ایک ایثار پیشہ، بےلوث قیادت ہی ان میں بیساکھیوں کی بجائے اپنے پاؤں پر آپ کھڑے ہونے کے ذوق جنوں کی آبیاری کرسکتی ہے، نامساعد حالات کے سامنے سپرانداز ہوتے چلے جانے کے بجائے ان میں ان سے پنجہ آزمائی کی خفیہ اہلیت کو بیدار کرنے کی کوشش کرسکتی ہے اور جو کچھ کھو گیا ہے اس کی بازیافت کا ولولہ بھی پیدا کرسکتی ہے؛ لیکن یہ خواب کل بھی تعبیر سے تہی تھا، آج بھی اس کی خوش کن تعبیر حقیقت کا روپ دھارنے سے گریزاں نظر آرہی ہے؛ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ مسلمانوں میں ایک مضبوط اور ایثار پیشہ قیادت ابھر ہی نہیں سکتی، یہ ناممکن نہیں ہے، وہ وقت ضرور آئے گا، جب ہم اور آپ اس خواب کو حقیقت بنتا دیکھیں گے، آواز وہی باوزن کہلاتی ہے جو اسمبلیوں اور پارلیمنٹ کے ایوانوں میں گونجتی ہے جو اخباروں کے صفحات میں پڑھی اور الیکٹرانک میڈیا کی نشریات میں سنی جاتی ہے، مسلمانوں کو اپنی سیاسی تنظیم کے ذریعہ اپنی آواز میں یہ وزن پیدا کرنا ہوگا، یہی وہ راستہ ہے جو انھیں حقوق کی بازیافت اور عزت وتوقیر کی منزل مراد تک پہنچا سکتا ہے۔"

(بقیہ صفحہ: ۳۴ سے)

ہمارا مشورہ ہے کہ آج کے اس میڈیائی دور میں مسلم ممالک کا اپنا علیحدہ میڈیا ہونا چاہئے جس کے ذریعہ ہم دشمنان اسلام کے سامنے دین کی صحیح شکل پیش کرسکیں، ہندوستان کے اہل ثروت بھی اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کریں جو قومیں اپنے زور بازو کے بجائے غیروں کی طاقت پر انحصار کرتی ہیں انھیں تاریخ کبھی معاف نہیں کرتی۔

دعوتِ فکر و عمل

ہندوستان میں مستشرقین کا چیلنج اور علماء کی ذمہ داری

از: مولانا محمد عبداللہ قاسمی*

لفظ مستشرق کی جمع مستشرقین ہے، مستشرق کے لغوی معنی ہیں وہ فرنگی جو مشرقی زبانوں اور علوم کا ماہر ہو، مستشرقین کے وضاحتی معنی یہ ہیں کہ مغرب (مراد یورپی ممالک) کے جو لوگ علوم اسلامیہ کو مسخ کرنے، اسلامی تعلیمات میں شکوک وشبہات پیدا کرنے، اسلام کی تشکیل جدید اور قرآن وحدیث وفقہ کی نئی ترتیب وتہذیب کے نعرے لگانے اور امت مسلمہ میں انتشار وافتراق پیدا کرنے کی غرض سے اسلامی علوم وفنون اور تاریخ اسلام کی تعلیم ومطالعہ کے لئے اپنی زندگیاں وقف کردی ہیں۔ ان لوگوں میں یہود اور نصاریٰ دونوں شامل ہیں، ان کو مستشرقین کہا جاتا ہے استشراق کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ تیرہویں صدی عیسوی میں عیسائی دنیا صلیبی جنگوں میں ناکام ہوئی تو تحریک استشراق شروع کی گئی جس کے بیک وقت دو نشانہ تھے۔ اس کا اولین مقصد یہ تھا کہ اسلام کی غلط تصویر پیش کرنا اور مذہب عیسوی کی برتری ظاہر کرنا اور دوسرا مقصد اہل مغرب کو مشرق میں اقتدار کی راہ پیدا کرنا تھا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں عیسائی پادری اور یہودی علماء اسلامیات کے مطالعہ کے لئے وقف کئے گئے۔ خفیہ مقامات پر تعلیم گاہوں کا نظم کیا گیا جہاں قرآن، حدیث، فقہ، کلام، تاریخ اور دیگر متعلقات علوم کا درس دیا جانے لگا لیکن تشریح وتفہیم اس طرح ہوتی کہ مسیحی مغرب کے افکار واقدار کی عظمت سامنے آتی اور اسلام کے دینی افکار اور اقدار کی کوئی وقعت اور قیمت نہ ہوتی اور یہ ذہن نشین کرایا جاتا کہ اسلام موجودہ زندگی کے مزاج کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اس قسم کی تعلیم گاہوں کے فارغین کے ذریعہ ملک مصر میں "فرعونی" اور ملک عراق میں "آشوری" شمالی افریقہ میں "بربری" فلسطین ولبنان کے ساحل پر "ہٹی" تہذیب وزبان کی احیاء کی تحریکیں شروع ہوئیں، ان کے مستقل داعی پیدا کئے گئے، انھوں نے اسلامی تہذیب اور عربی زبان کو نقصان پہنچانے کے لئے شدومد کے ساتھ یہ کہنا شروع کیا کہ قرآن کی فصیح عربی زبان موجودہ زمانہ کی ضروریات کو پورا نہیں کرسکتی اس کے بجائے عوامی اور مقامی زبانوں کو رواج دیا جائے اور ان ہی کو اخبارات اور کتابوں کی زبان بنادیا جائے۔ مستشرقین کے چیلے مشرقی ممالک میں آئے تو اپنے آپ کو روشن خیال، تجدد پسند، مصلح دین، محقق، مفکر ظاہر کیا اور

* ناظم مجلس علماء مرہٹواڑہ، اورنگ آباد مہاراشٹر

اپنے باطل طریقہ کار کو سائنٹفک اور سسٹمیٹک بتایا اس کے بالمقابل علماء حقانی، سلف صالحین اور مصلحین و مجددین کے طریقے کو دقیانوسی اور نامعقول بتایا، اس سے بھی آگے بڑھ کر مستشرقین نے یورپ وامریکہ اور کناڈا میں قائم کردہ اسلام کی تحقیق کے نام نہاد تعلیمی اداروں کے دروازے مسلمانوں کے لئے کھول دیئے۔ اور بڑے بڑے وظیفے دے کر مسلمانوں کے ذہین اور تعلیم یافتہ طبقہ کو اپنی طرف کھینچا اور اپنے سانچے میں ڈھال لیا۔ ان میں سے بعض مستشرقین کا آلہ کار بنے۔ یہ ادارے گاہ بگاہ سیمناریں اور مجالس مذاکرات منعقد کرتے رہتے ہیں ان میں اسلامی عقائد اور اسلامی تہذیب پر تحقیر آمیز تنقید کرتے ہیں اور علماء کرام کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ان کا ایک جدید نعرہ "اجتہاد" ہے اور اجتہاد کا حق ہر اس مسلمان کو حاصل ہے جو بقول ان کے قرآن کریم کے ترجمے کو کسی بھی زبان میں پڑھ سکتا ہو، مستشرقین کا کہنا ہے کہ مجتہد کو عربی زبان، صرف ونحو، لغت، قرآن وعلم تفسیر، حدیث، آثار صحابہ، علم فقہ، علم عقائد، اصول فقہ، ناسخ ومنسوخ وغیرہ علوم کی جاننے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ کسی کے اندر ان علوم کے جاننے کے باوجود نئے مسائل کے استنباط کی صلاحیت بھی ہے یا نہیں؟ اگر کوئی شخص عربی زبان اور دیگر علوم دینیہ حاصل کئے بغیر صرف ترجمہ قرآن کی مدد سے آیات قرآنیہ میں اپنی رائے زنی کر سکتا ہے تو وہ مجتہد ہو سکتا ہے اور فقہ اسلامی میں ٹانگ اڑا سکتا ہے۔

واضح رہے کہ ماضی میں مستشرقین نے قرآن، حدیث، سیرت، فقہ، تاریخ اسلام پر پرفریب تنقید کی تھی اس وقت کے علماء کرام نے ان کے مدلل جوابات دیئے تھے اور ان کی غلطیوں سے عوام کو روشناس کرایا تھا اس اہم فریضہ کو انجام دینے میں بالخصوص سیرت النبی...... کے بارے میں مولانا شبلی نعمانیؒ لکھنوٴ کا نام نمایاں ہے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بانی سرسید احمد خاں نے بدنام زمانہ ولیم میور کے سیرت نبوی پر کئے ہوئے اعتراضات کا اپنے طور پر جواب دیا اور اس سلسلہ میں انھوں نے انگلستان کا دورہ کیا۔ سیرت پر ان کا یہ کام انگریزی اور اُردو زبانوں میں شائع ہو چکا ہے اور پھر جب انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبہ دینیات قائم کیا تو اس میں ان علماء ہی کو رکھا جن کے علم وعزم پر اعتماد تھا۔ سرسید احمد خاں نے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند سے علی گڑھ میں دینیات کے لئے معلم مانگا تو آپ نے وہاں اپنے داماد کو بھیج دیا جو علی گڑھ میں دینیات کے پہلے ناظم مقرر ہوئے تھے۔

مختصر یہ کہ آج جبکہ مستشرقین علم وتحقیق کے نام پر ایسے نظریات اور اصطلاحات پیش کرتے ہیں جن سے اسلامی تعلیمات کے خلاف ارتداد اور انحراف کی فضا پیدا ہو جائے اور نئی نسل کا تعلیم یافتہ طبقہ عیسائیت کے حلقہ بگوش ہو جائے تو موجود دور کے فکر اور فلسفے کو غلط ثابت کرنے کی سعی ضروری ہے۔ اس وقت علمائے ہند کے

کاندھوں پر کتنی ذمہ داری ہے اس کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے فرمایا ہے کہ اسلام وہ مذہب ہے کہ جس دن وہ دین بنا اسی دن وہ سیاست بھی تھا۔ اس کا منبر، اس کا تخت، اس کی مسجد، اس کی عدالت، اس کی توحید نمرودوں اور فرعونوں، قیصروں اور کسراؤں کی شہنشاہی کے مٹانے کا پیغام تھی۔ صحابہ اور خلفاء کی پوری زندگیاں ان مرقعوں سے بھری پڑی ہیں اور وہی اسلام کی سچی تصویریں ہیں اور جب تک علماء علماء رہے وہی ان کا اسوہ تھا۔ آج ضرورت ہے کہ اسی نقش قدم پر چلیں جو ہمارے اسلاف نے ہمارے لئے چھوڑا ہے۔ آج علماء کا کام صرف پڑھانا، مسئلے بتانا اور فتوے دینا سمجھا جاتا ہے، لیکن اب وقت ہے کہ اپنے اسلاف کے وقت کو پھر دہرائیں اور دیکھیں کہ ان کا کام صرف علم ونظر تک محدود نہیں بلکہ سعی وعمل اور عملی خدمت بھی ان کے منصب کا اہم فرض ہے۔

آج کئی گوشوں سے یہ صدا گونجنے لگی ہے کہ دور حاضر میں علماء کو چھوڑیئے ان سے رابطہ نہ رکھئے ان کے بغیر راست ترجمہ قرآن کی مدد سے اسلامی تعلیمات کو سمجھئے، آج نئے شارحین کی ضرورت ہے، یہ آواز مستشرقین کی اور ان کے تربیت افراد کی آواز ہے، نئے ترجمہ، نئے شارحین مغرب سے نکل رہے ہیں بقول مولانا تقی عثمانی آج امریکہ، کینیڈا اور یورپ کی یونیورسٹیوں میں بھی اسلامی تعلیم ہورہی ہے۔ اسلام پڑھایا جارہا ہے وہاں پر بھی حدیث فقہ اور تفسیر کی تعلیم کا انتظام ہے ان کے مقالات اگر آپ پڑھیں تو ایسی ایسی کتابوں کے نام نظر آئیں گے جن کا ہمارے سیدھے سادھے مولویوں کو بھی پتہ نہیں ہوتا۔ بظاہر بڑی تحقیق کے ساتھ کام ہورہا ہے لیکن وہ دین کی کیا تعلیم ہوئی جو انسان کو ایمان کی دولت بھی عطا نہ کرسکے۔ صبح سے شام تک اسلامی علوم کے سمندر میں غوطے لگانے کے باوجود ناکام ہی لوٹتے ہیں اور اس کے قطرہ سے حلق بھی تر نہیں کرتے۔ مغرب کی ان تعلیم گاہوں میں کلیۃ الشرعیہ بھی ہے، کلیۃ اصول الدین بھی ہے لیکن اس کا کوئی اثر زندگی میں نظر نہیں آتا۔ ان علوم کی روح فنا کردی گئی ہے۔

مستشرقین کے چیلنج کے مدنظر علامہ سید سلیمان ندوی کے اس ارشاد گرامی پر عمل کرنے کی ضرورت ہے کہ ہر آبادی جہاں علماء رہیں وہ ان کی سعی اور خدمت سے آباد رہے۔ وہاں جاہلوں کو پڑھانا۔ نادانوں کو سمجھانا، غریبوں کی مدد کرنا مسلمانوں کو ان کی کمزوریوں سے آگاہ کرنا ایک عالم دین کا فرض ہے۔ ہمارا تاثر اور تجزیہ ہے کہ مغرب نے ذہنی علمی جنگ کا چیلنج پیش کیا ہے اس کے لئے ہم کو اس شعور اور آگاہی سے کام لینا پڑے گا جس کے لئے تاریخ کے صفحات پر ہماری شناخت بنی تھی۔ آج ذہنی علمی جنگ بغیر مکمل تیاری کے نہیں لڑی جاسکتی۔

(بقیہ صفحہ ۳۱ پر)

فضائل وآداب

ماہِ محرم: فضائل ومسائل

مولانا ندیم احمد انصاری*

محرم کی وجہِ تسمیہ

علامہ سخاویؒ نے ذکر کیا ہے کہ 'محرم کے مہینے کو محرم اس کی تعظیم کی وجہ سے کہتے ہیں' لیکن میرے نزدیک تو اس نام کی وجہ اس کی حرمت کی تاکید ہے۔ اس لیے کہ عرب زمانۂ جاہلیت میں اسے بدل ڈالتے تھے، کبھی حلال کرڈالتے، کبھی حرام کرڈالتے۔ (تفسیر ابن کثیر)

ماہِ محرم کی فضیلت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: رمضان کے بعد افضل ترین روزے اللہ تعالیٰ کے مہینے 'محرم' کے ہیں۔ (مسلم) اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے محرم الحرام کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف فرمانا اس مہینے کے شرف اور خصوصی فضیلت پر دالّ ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ اپنی خصوصی مخلوق کی نسبت ہی اپنی طرف فرماتا ہے۔ (لطائف المعارف) اس حدیث سے پورے ماہِ محرم کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ (الکوکب الدری) نیز حضرت ابن عباسؓ نے 'سورۂ فجر' میں آیت 'والفجر' کے متعلق ارشاد فرمایا ہے کہ اس سے مراد 'ماہِ محرم الحرام کی پہلی تاریخ کی فجر ہے، جس سے اسلامی سال کا آغاز ہوتا ہے'۔ حضرت قتادہؒ سے بھی یہی منقول ہے، گو اس میں بہت سے اقوال ہیں۔ (الجامع الاحکام القرآن للقرطبی)

حرمت والا مہینہ

محرم الحرام اسلامی سال کا پہلا مہینہ ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے: اللہ کے نزدیک مہینے گنتی میں بارہ ہیں، جس روز سے اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔ اللہ کی کتاب میں سال کے بارہ مہینے لکھے ہوئے ہیں، ان میں سے چار مہینے ادب کے ہیں۔ (التوبہ)

---

* ڈائرکٹر الفلاح اسلامک فاؤنڈیشن، انڈیا

ماہِ محرم میں روزے کی فضیلت

حضرت نعمان بن سعد حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ کسی نے ان سے پوچھا کہ آپؓ رمضان کے علاوہ مجھے کس مہینے میں روزے رکھنے کا حکم فرماتے ہیں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے اس کے متعلق ایک آدمی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کرتے ہوئے سنا۔ اس وقت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا۔ اس نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ مجھے رمضان کے علاوہ کون سے مہینے میں روزے رکھنے کا حکم فرماتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر تم رمضان کے بعد روزہ رکھنا چاہو تو محرم کے روزے رکھا کرو، کیوں کہ یہ اللہ کا مہینہ ہے۔ اس میں ایک ایسا دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے ایک قوم کی توبہ قبول کی تھی اور اسی دن دوسری قوم کی توبہ قبول کرے گا۔ (ترمذی)

عاشوراء کے روزہ کی فضیلت واحکام

دسویں محرم کو عاشوراء کہتے ہیں۔ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عاشوراء کے روزے کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا: عاشوراء کا روزہ، گذشتہ ایک سال کے گناہوں کا کفارہ ہوجاتا ہے۔ (مسلم) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یومِ عاشوراء میں روزہ رکھنے کو اپنا اصول ومعمول بنایا اور مسلمانوں کو بھی اس کا حکم دیا تو بعض صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اس دن کو تو یہود ونصاریٰ بڑے دن کی حیثیت سے مناتے ہیں (گویا یہ ان کا قومی ومذہبی شعار ہے) اور خاص اس دن ہمارے روزہ رکھنے سے ان کے ساتھ اشتراک اور تشابہ ہوتا ہے تو کیا اس میں کوئی ایسی تبدیلی ہوسکتی ہے، جس کے بعد یہ اشتراک اور تشابہ والی بات باقی نہ رہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: انشاء اللہ جب آئندہ سال آئے گا تو ہم نویں محرم کو بھی روزہ رکھیں گے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ آئندہ سال ماہِ محرم آنے سے قبل ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وفات پاگئے۔ (مسلم)

فقہاء وعلماء کے اقوال

فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ محرم کی دسویں تاریخ کا روزہ اور اس کے ساتھ ایک دن پہلے یا بعد یعنی نویں یا گیارہویں تاریخ کا روزہ رکھنا مستحب ہے، اور صرف عاشوراء کا روزہ رکھنا مکروہِ تنزیہی ہے، اس لیے کہ اس میں یہود کی مشابہت ہے۔ (شامی) البتہ حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے ایک بات لکھی ہے کہ ہمارے زمانہ میں چونکہ یہود ونصاریٰ وغیرہ یومِ عاشوراء کا روزہ نہیں رکھتے، بلکہ ان کا کوئی کام بھی قمری مہینوں کے حساب سے نہیں

ہوتا، اس لیے اب کسی اشتراک اور تشابہ کا سوال ہی نہیں، لہٰذا فی زماننا رفعِ تشابہ کے لیے نویں یا گیارہویں کے روزہ رکھنے کی ضرورت نہ ہونی چاہیے۔(معارف الحدیث)

یہ بھی خیال رہے کہ ان روایات میں جن گناہوں کی معافی کا ارشاد اور وعدہ ہے اس سے مراد صغائر ہیں، باقی کبیرہ گناہوں کی معافی کی بھی امید رکھنی چاہیے، مگر ان احادیث کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان کے بھروسہ پر گناہ کرنے لگے۔ گناہوں پر نادم ہو اور پاکباز رہنے کی کوشش کرتا رہے، تو یہ چیزیں انشاء اللہ مددگار ثابت ہوں گی۔

عاشوراء کے دن اہل وعیال پر وسعت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص عاشوراء کے دن اپنے اہل وعیال پر رزق میں وسعت کرے، اللہ سبحانہ وتعالیٰ پورے سال اس کے رزق میں برکت ووسعت فرمائیں گے۔(الترغیب والترہیب) مطلب یہ ہے کہ اس دن میں جس کا نفقہ اپنے ذمّے ہے، ذرا وسعت کے ساتھ ان کو یا اس کو جس کی کفالت میں وہ ہوں دے دیا جائے، واللہ اعلم۔(نوادر الحدیث)

یومِ عاشوراء میں کیا کیا جائے؟

عاشوراء کہ موقع سے لوگوں نے بہت سی واہی تباہیں باتیں ایجاد کر رکھی ہیں۔ لیکن علامہ ابن تیمیہؒ ان کے متعلق فرماتے ہیں کہ اس سلسلے میں نہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی صحیح حدیث وارد ہوئی ہے اور نہ کسی صحابی سے (کوئی اثر)۔ اسے ائمہ مسلمین، بشمول ائمۂ اربعہؒ وغیرہم نے مستحب گردانا ہے اور نہ کسی مستند کتاب میں اس کا تذکرہ منقول ہے۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، صحابہ کرامؓ اور تابعین عظامؒ سے اس کے متعلق کوئی روایت نہیں۔ نہ صحیح، نہ ضعیف۔ نہ کتبِ صحاح میں اس کا ذکر ہے اور نہ کتبِ سنن میں، اور خیر القرون سے بھی ایسی کوئی روایت معلوم نہیں ہوتی (جن میں ان کا تذکرہ ہو)۔(مجموع الفتاویٰ)

نیز مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ یومِ عاشوراء سے متعلق شریعت نے خاص دو چیزیں بتلائی ہیں: (۱) روزہ رکھنا (۲) اہل وعیال پر کھانے پینے وغیرہ میں وسعت کرنا۔ نیز مصیبت کے وقت استرجاع کا حکم ہے، اور اس تاریخ میں ایک الم انگیز واقعہ جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا پیش آیا، اس کی یاد سے صدمہ ضرور ہوگا، لہٰذا انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھتے رہیں، اس کے علاوہ اس دن کے لیے کوئی حکم نہیں دیا گیا۔

(فتاویٰ رحیمیہ ترتیبِ صالح)

ذکرِ رفتگاں

مولانا عبدالمومن نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

ایک داعی و مصلح اور عبادت گزار عالم، ایک محبوب فرد خاندان، ایک شفیق ومہربان ہستی

از: مولانا یحییٰ نعمانی زید مجدہٗ*

عم محترم مولونا عبدالمومن رحمۃ اللہ علیہ کا حادثۂ وفات راقم سطور کے لیے نہایت المناک و دردانگیز سانحہ ہے۔ میرا ان سے اتنا گہرا اور متنوع تعلق تھا کہ اس کو بیان کرنا ممکن نہیں۔ وہ ہمارے والدین کے عم زاد بھائی (اور اپنی نسل کے سب سے چھوٹے فرد ہونے کی وجہ سے) بہت عزیز بھائی تھے۔ والد صاحب کو ان کے والد اور اپنے چچا حضرت مولانا حکیم محمد احسن صاحبؒ سے اور ان کی والدہ یعنی اپنی چچی مرحومہ سے غیر معمولی انس ومحبت تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہماری دادی مرحومہ والد ماجد مدظلہ کو آٹھ سال کی عمر میں ہی چھوڑ گئی تھیں، پھر ساری زندگی چچا صاحب اور چچی صاحبہ نے مہر ومحبت میں اپنی اولاد کا سا معاملہ رکھا۔ ابا جان چچا صاحب (اور چچی صاحبہ کے بھی) لطف ومہر کے بے مثال قصے بتاتے ہیں۔ ان بھائیوں سے والد ماجد کو اور ان بھائیوں کو بھی بالکل سگے بھائیوں والا تعلق ہی رہا۔ یہاں تک کہ دادا جان کی وفات کے بعد تو ہم نے یہی دیکھا کہ سنبھل میں وہ چچا صاحب ہی کے مکان پر سوتے اور اکثر چچا زاد بھائیوں ہی کے ساتھ کھانا کھاتے۔ عم محترم مولانا عبدالمومن رحؒ بھی لکھنؤ میں (جہاں بہت آنا ہوتا) ہمیشہ ہمارے گھر ہی قیام کرتے۔

رشتوں کا یہ پس منظر تھا۔ ہماری عمروں میں بھی بس نو برس کا فرق تھا، اس پر ان کی سراپا محبت والفت طبیعت مستزاد، ہم نے بچپن سے ان کو اپنے ساتھ غیر معمولی محبت کرنے والا پایا۔ وہ ایک شفیق چچا اور ماموں بھی تھے۔ اور ہم ان کو ممّا، یا مومن ممّا ہی کہتے تھے۔ بے تکلفی ایسی کہ برادرانہ رشتے اور دوستی کا بھی رنگ رکھتی تھی۔ بزرگوں کی طرح نصیحت بھی کرتے، دوستوں کی طرح مزاح ومذاق بھی کرتے، ہدیوں تحفوں سے کرم گستری رکھتے تھے۔ آم کا بہت شوق تھا۔ لکھنؤ آتے تو ہم کو خوب آم کھلاتے۔ ہم سنبھل جاتے، خوب آم کے دور چلتے۔ انواع واقسام منگائی جاتیں۔ مہمان نوازی تو اس گھر کی مشہور ہے۔ ہمارے ساتھ تو اس کا بہت ہی اظہار ہوتا۔

* ناظم المعہد العالی للدراسات الاسلامیہ لکھنؤ

سنبھل میں ہماری فرودگاہ تو برادر گرامی جناب مولانا وسیم اصغر صاحب کا گھر ہوتی ہے۔مگر وہ چاہتے کہ زیادہ سے زیادہ ان کے ساتھ کھانا کھایا جائے۔ نہایت پر لطف مزاح سے کوئی مجلس کیا،فون کی کال بھی خالی نہیں ہوتی۔ ہماری مجلس عجب باغ و بہار ہوتی،جس میں تسلی و تازگیِ طبع کا بے بدل سامان ہوتا۔ بے شمار نقوش یاد داشت کے پردے سے قلم کی نوک پر آنے کو بیتاب ہورہے ہیں ۔مگر مضمون کی گنجائش مانع ہے۔

مولاناؒ نے جس گھر میں آنکھیں کھولیں وہ علم وعبادت سے آباد تھا۔ان کے دادا صوفی احمد حسین مرحوم ایک بلند مقام ولی، زاہد، کثیر العبادت اور بڑی بابرکت شخصیت تھے۔قادری سلسلے کے بعض مشائخ سے متعلق تھے۔ علم تو کچھ خاص نہیں تھا۔مگر زہد وعبادت میں ان کا حال بہت بلند تھا۔احوال ومواجید سے حصہ پایا تھا۔اللہ نے تجارت اور زمین داری سے نوازا تھا۔لیکن زہد وتقشّف کا حال یہ تھا کہ نہایت سادہ صوفیوں کا لباس اور طرز معاش تھا،جس نے شہر میں ''صوفی'' ان کے نام کا جز بنا دیا تھا۔غریب پروری کی عجب شان تھی۔ دروازہ پر فقیر آتا تو اس دور میں (آج سے سو سال پہلے) روپیے سے کم دینا گوارا نہیں کرتے۔ان کی مجلس کی شان یہ تھی کہ سائل بھی ان کے ہم سر ہوکر بیٹھتا اور ساتھ کھانا کھاتا تھا۔ایک مرتبہ ایک فقیر آیا۔انہوں نے اپنی اہلیہ سے کہلایا کہ ایک روپیہ بھیج دیں، انہوں نے کہا کہ روپیہ تو نہیں ہے۔کہلایا دو کا نوٹ ہو تو وہ بھیج دیں۔انہوں نے جواب دیا دس سے کم کا نوٹ نہیں ہے۔انہوں نے وہی منگوا کر سائل کی نذر کردیا۔گھر آکر کہا: میں تو ایک روپیہ ہی دینا چاہتا تھا،مگر اس کی قسمت میں دس ہی تھے۔گھر میں سالن پکتا تو اہلیہ سے آنکھ بچا کر پانی ڈال دیتے۔اہلیہ خفا ہوتیں،تو کہتے کسی کے یہاں کچھ بھیج دینا۔

صوفی جی عمر بھر کے شب بیدار تھے۔ان کے انتقال کے بعد صاحب زادے حضرت نعمانیؒ نے اپنی والدہ مرحومہ سے پوچھا کہ ابا جی کی کبھی تہجد قضا ہوتی تھی؟ انہوں نے کہا بہت عرصے پہلے کبھی ایسا ہوجاتا تھا۔ لیکن وہ اس دن لازماً روزہ رکھتے تھے۔مگر تیس سال سے غالباً کبھی تہجد قضا نہیں ہوئی۔نوافل کے علاوہ مختلف اوقات میں جواذکار ان کے معمول تھے ان کی تعداد بیس ہزار تھی۔ایک عرصے تک رات میں کھڑے ہوکر چار ہزار مرتبہ درود شریف پڑھنے کا معمول تھا۔اسی دوران ایک دن ایک عجیب مکاشفہ ہوا۔فرمایا کہ مجھ پر کھڑے کھڑے ایک خاص کیفیت نینداور بیداری کے بیچ کی طاری ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے۔اور انہوں نے مجھ کو دو رکابیاں (پلیٹیں) عطا فرمائیں،ایک مٹی کی اور ایک چاندی کی۔صوفی جی فرماتے تھے کہ میں نے اس سے یہ سمجھا ہے کہ مٹی کی رکابی دنیا ہے اور چاندی کی رکابی دین ہے۔اور مجھے یہ دونوں عطا ہوں گی۔ پھر فرماتے تھے دنیا تو الحمد للہ خوب مل گئی،لیکن دین ابھی نصیب نہیں ہوا۔شاید میری اولاد میں کوئی

غیر معمولی شان کا پیدا ہو جائے اور یہ بشارت اس کے ذریعہ پوری ہو جائے۔

(مستفاد از مضمون حضرت مولانا نعمانیؒ، الفرقان رمضان ۱۳۶۷ھ)

ان کے والد حضرت مولانا حکیم محمد احسنؒ دارالعلوم دیوبند کے فارغ اور حضرت مدنیؒ کے دست گرفتہ تھے۔ مستقل کے تہجد گزار تھے۔ قبل فجر بڑے سوز وانہماک سے ذکر بالجہر کا معمول تھا۔ صلہ رحمی اور سخاوت میں طاق تھے۔ ہم نے ان کے جو حالات دیکھے اور گھر کے بڑوں سے سنے وہ بتاتے ہیں کہ اس بندۂ خدا کا دل محبت دنیا سے خالی تھا۔ حکیم صاحب مرحوم نے علاقے کی دینی فکر کو ساری فکروں پر غالب اور ہمیشہ مقصد زندگی رکھا۔ مولانا مرحوم کی والدہ بھی بڑی سادہ خاتون تھیں۔ ہم نے ان کو سدا تہجد گزار اور نہایت کثیر التلاوت پایا۔ ان کے اعمام میں حضرت مولانا نعمانی کی دینی شخصیت تو معروف ہے ہی دیگر چچا بھی سب شب بیدار اور ذکر وعبادت کے ذوق شناس تھے۔

گھر کا یہ ماحول تھا جس کے بیچ مولانا مرحوم کی پیدائش ۱۹۶۳ میں ہوئی۔ تعلیم کی ابتدا محلہ کے قدیم مدرسہ واقع روضہ والی مسجد سے ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اور دو پارے حفظ انجمن معاون الاسلام میں کیے۔ ۱۹۷۳ء میں وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے شعبۂ حفظ میں داخل کیے گئے۔ یہ حافظ اقبال صاحبؒ کا دور تھا، جو حفظ کی تدریس میں بڑی شہرت رکھتے تھے اور ان کے طلبہ پختگیِ حفظ اور تصحیح ادا میں معروف تھے۔ یہاں لکھنؤ میں اس وقت ان کی ہمشیرہ (مرحومہ اہلیہ مولانا عتیق الرحمان سنبھلی) کا بھی قیام تھا۔ حافظ اقبال صاحب کے یہاں اس دور میں یہ مانا جاتا تھا کہ حفظ قرآن کی لازمی شرط خوب زدوکوب ہے۔ اس سے فیضیابی اور بہن کے پاس جانے اور رونے کے قصے خوب مزے لے کر سنایا کرتے تھے۔ ۱۹۷۸ء میں حفظ کی تکمیل ہوئی اور عربی تعلیم شروع ہوئی۔ درمیان میں سن ۸۳ / ۸۴ میں ایک سال کے لیے دارالعلوم تاج المساجد بھوپال میں بھی زیر تعلیم رہے۔ ۸۴ء میں ندوے واپس ہوئے۔

اس وقت ہم ندوۃ العلماء کے درجۂ ہفتم معہد (ثانویہ ثانیہ) میں تھے، مدرسہ میں بچوں کی ثقافتی بزم، بزم ادب کا وہ سنہرا دور تھا۔ اس کا سالانہ مقابلہ جب ہوتا، پورے دارالعلوم کا مرکز توجہ بن جاتا۔ ایک دھوم کا سماں ہوتا۔ خصوصا ہمارے استاد جناب مولانا عبد العزیز بھٹکلی مدظلہ (حالیہ نائب مہتمم دار العلوم) اس کو سجانے سنوارنے، طلبہ کی تیاری اور انعامات کی دستیابی میں ایسی محنت کرتے کہ ہم نے کہیں اس کی نظیر نہیں دیکھی۔ اب یاد نہیں کہ مما مرحوم کی تحریک تھی، یا ہم نے از خود عربی تقریر کے مقابلہ میں حصہ لیا۔ وہ اس وقت عالیہ ثالثہ کے طالب علم تھے۔ انہوں نے بڑی خوبصورت اور بلیغ عربی تقریر ہم کو لکھ کر دی۔ ان کا قیام رواق اطہر زیریں کے

۸ نمبر کمرے میں تھا۔ روزانہ کئی مرتبہ اپنے کمرے میں وہ ہم کو تقریر کے خالص عربی لہجہ اور طرز القاء کی مشق کراتے۔ ہم نے اس مقابلہ میں پہلا انعام حاصل کیا۔ تقسیم انعامات کے جلسے میں حضرت مولانا علی میاںؒ کے ساتھ امارات کے رسالہ مجلۃ المنار کے ایڈیٹر (جن کا نام عبدالفتاح تھا) بھی موجود تھے۔ ہماری عمر بس گیارہ سال تھی، انہوں نے جا کر اپنے رسالہ میں ہمارا فوٹو شائع کیا اور ہماری (رٹی ہوئی) تقریر کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا: وقد ألجم لسانی بخطبته البليغة ...'' یہ دراصل تقریر لکھنے اور مشق کرانے والے کا کمال تھا۔ مرحوم کی داستان شفقت کا یہ یاد آنے والا پہلا نقش ہے۔ اگلے سال پھر ان کی لکھی تقریر اور مشق نے ہم کو پہلا انعام دلایا۔

ندوے میں وہ نمایاں طلبہ میں شمار ہوتے تھے۔ ۱۹۷۸ء میں فراغت کے بعد وہ ایک سال اور درجۂ فضیلت سے متعلق رہے۔ ادھر ان کے والد ماجدؒ کا (جو علاقہ میں دینی مرکز اور اہل حق کے نمائندہ شخصیت کا مقام رکھتے تھے) تقاضہ ہوا کہ وطن آ کر مدرسہ کی نشأۃ ثانیہ کی جائے۔ اور سنبھل اور اطراف میں دینی کام کی طرف متوجہ ہوا جائے۔ سنبھل اور اطراف کثیر مسلم آبادی کا علاقہ ہے۔ یہاں اس وقت بدعات وخرافات کا دور دورہ تھا۔ ضرورت تھی کہ اس خزاں رسیدہ علاقہ کو مرکز بنا کر کوئی شخصیت دین حق کی محنت کرے۔ مولانا عبدالمومنؒ کو اللہ تعالیٰ نے اس کام کے لیے قبول کیا اور ان کے نفس تازہ سے اس خزاں رسیدہ چمن میں زندگی پیدا ہوئی۔ پہلے چالیس دن کے لیے تبلیغ میں وقت لگایا۔ پھر سنبھل گئے، بوسیدہ مدرسے کو زندہ کیا اور علاقے میں جاں فشاں محنت کا سلسلہ شروع کیا۔

اللہ نے مرحوم کو بلند ہمت اور سخت جفاکشی کا عادی بنایا تھا۔ تھکنا تو وہ جانتے ہی نہیں تھے۔ انہوں نے جب مدرسہ سنبھالا تو وہاں نہ طلبہ تھے، نہ سرمایہ۔ سائیکل پر گاؤں گاؤں جا کر غلہ جمع کیا۔ کسی طرح مطبخ کا کچھ انتظام ہوا تو اسی طرح دورے کر کے طلبہ لائے۔ گھر میں اس وقت (اینٹ کے) بھٹے کا آغاز ہی تھا، والد صاحب کے مطب سے اور کچھ کھیتی سے الحمدللہ سفید پوشی تھی۔ خود کو بس اس کا ہی سہارا تھا۔ تنخواہ مدرسے سے نہیں لیتے تھے۔ اس دور میں ان کی فکر پر مدرسہ سوار تھا۔ بقرعید کے موقعے پر چرم قربانی جمع کرنے میں وہ اس بے نفسی سے محنت کرتے کہ حیرت ہوتی تھی۔ آخر مدرسے کی تحصیل کے لیے دوسرے علاقوں میں جانا شروع کیا۔ اس کے لیے اپنے عم بزرگوار حضرت مولانا نعمانیؒ سے خطوط لکھوائے۔ ندوے کے اپنے بڑوں سے بھی تصدیقات لیں۔ کسی طرح کچھ کام آگے بڑھا۔ ان کا ایک خاص امتیاز یہ تھا کہ وہ مدرسے کے لیے تحصیل میں اپنا دینی وقار ضرور باقی رکھتے۔

صبح سے شام تک مدرسے ہی میں رہتے۔ دن بھر پڑھاتے، مطبخ کی نگرانی کرتے، صفائی خود کرتے اور عملہ سے کراتے۔ شام میں شہر اور گاووں میں جا جا کے بیان کرتے۔ مدرسہ کی وسیع جامع مسجد شہر کے وسط میں واقع ہے۔ اس میں جمعہ کا بیان بہت اہتمام سے کرتے۔ میری نظر میں ان کی سب سے بڑی خدمت تقریبا ۳۵ سال تک دیا گیا یہی جمعہ کا بیان تھا۔ قریبی بستی اور شہر سنبھل کے علاوہ اطراف کے دیہات سے بھی لوگ اس میں شرکت کے لیے آتے۔ بیان کے لیے مطالعہ کر کے تیاری کرتے۔ انداز بیان بڑا طاقتور تھا۔ ان بیانات سے علاقہ کو بہت دینی فائدہ پہنچا۔ ہمارا علاقہ بدعات زدہ علاقہ تھا۔ بریلی کے مشہور شدت پسند مسلک کو بہت طاقت حاصل تھی۔ مولانا مرحوم کی تگ و دو اور بیانات وجد وجہد سے بڑی اصلاح ہوئی۔ انہوں نے اکابر علماء کو بلا کر بے شمار جلسے کرائے۔ البتہ کبھی مناظرانہ یا فرقہ پسندانہ انداز اختیار نہیں کیا۔ ان کے تعاون سے تبلیغ کے کام کو بھی بہت مدد ملی۔ بلا مبالغہ علاقے میں بدعت کا زور ٹوٹ گیا۔ اور لوگ صحیح دینی رخ پر پڑ گئے۔ سنبھل اور اس کے اطراف میں ماضی قریب میں کسی شخصیت سے اتنا دینی کام انجام نہیں پایا ہے۔

غالبا ۱۹۹۸ء میں ان کا برطانیہ کا پہلا سفر ہوا۔ اس کے بعد وہاں کے بعض محبین رمضان المبارک میں ان کو اپنی مسجد میں بیانات کے لیے دعوت دینے لگے۔ وہاں ان کے بڑے پر اثر بیانات ہوتے۔ لندن، بولٹن اور پریسٹن کے لوگ ان کے سال بھر منتظر رہتے تھے۔ وہاں کے لوگوں کو ان کے بیانات میں ایک نئی دینی روح اور حالات کے مطابق کاموں کا پیام ملتا تھا۔

مدرسہ ترقی کرتا گیا۔ طلبہ ان کی تدریس وتفہیم کے بہت قائل تھے، دراصل وہ ہر کام میں بے پناہ محنت کرتے تھے۔ طلبہ کے ساتھ حسن سلوک میں بھی عجب معمول تھا۔ روزانہ مدرسے میں پوچھتے کوئی بیمار تو نہیں؟ بیمار طالب علم کے علاج کی فکر کرتے۔ نادار طلبہ پر بڑی شفقت تھی۔ ان کے گھروں کی بھی فکر کرتے۔ بار بار مدرسے میں دعوت کرواتے۔ کیا کیا خوبیاں یاد کریں۔ ایک دن کہنے لگے۔ بچوں کا کھانا کھانے کے وقت تک ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ میں دلی سے تھوک میں ہاٹ پاٹ لایا ہوں۔ سالن اب اس میں دیا جائے گا۔ اگر چہ بعد میں کسی وجہ سے اس طریقہ کو روکنا پڑا۔ آخر کے سالوں میں تو مصروفیات کا دائرہ بہت بڑھ گیا تھا، پہلے طلبہ کے ساتھ خوب وقت گزارتے۔ گھر دعوت کرتے، جو بچے ندوے آجاتے ان سے ملنے کے لیے مستقل سفر کرتے۔

وہ مدرسے کے کل ذمہ دار تھے۔ مگر اس شان سے کہ ان کا نہ کوئی دفتر تھا، نہ کوئی خصوصی میز کرسی یا مجلس۔ وہ عالم جو شہر بلکہ علاقے کا دینی مرجع تھا، خود ایک چلتا پھرتا خادم مدرسہ تھا، جو جمعہ کو مسجد کی صفائی بھی طلبہ کو ساتھ لے کر خود کرتا تھا۔ بیت الخلاء کی صفائی بھی دیکھتا تھا۔ مطبخ کی نگرانی بھی کرتا۔ ایک عرصہ تک گوشت بھی دکان

سے خود لانے کا اہتمام کیا۔ ایک مرتبہ تقریبا ایک سال تک باورچی نہیں رہا تو مطبخ میں طلبہ کی باری لگائی گئی، اور خود بھی اس میں شرکت کرتے تھے۔ ان کے فکر و توجہ سے علاقے میں دسیوں مساجد کی تعمیر ہوئی۔ خصوصا اس کی بڑی فکر تھی کہ بدعت زدہ علاقوں میں مساجد قائم ہوں۔ اس کے لیے خوب تگ و دو کرتے۔

قرآن بہت صاف، سادہ اور مؤثر انداز میں پڑھتے۔ تراویح میں بہت حظ آتا تھا۔ جوانی میں بھی شریعت کی پوری پابندی کرتے تھے۔ خصوصا نماز باجماعت کا اہتمام اپنی ذات میں بھی بہت تھا اور مدرسے میں بھی اس کی خوب فکر کرتے۔ فجر بعد تلاوت کا اہتمام کرتے۔ رمضان میں انگلینڈ میں بھی معمولات کا خوب اہتمام رہتا۔ عمر بڑھنے کے ساتھ یاد الٰہی اور راہ سلوک سے مناسبت پیدا ہوتی گئی۔ تا آنکہ ۲۰۰۵ء کے آس پاس وہ اپنے برادر محترم حضرت مولانا سجاد نعمانی مدظلہ کے مشورے سے نقشبندی سلسلے سے منسلک ہو گئے۔ ہر سال ایک عمرے کا معمول تھا۔ ساتھ جانے والے وہاں ان کے مجاہدے و کثرت عبادت کا جو حال بتاتے تھے وہ ہمارے لیے بہت قابل رشک ہونے کے باوجود، حیرت کا باعث بالکل نہیں تھے، کیوں کہ ہم جانتے تھے کہ وہ تھکنا نہیں جانتے۔ مرشدنا بقیۃ السلف حضرت مولانا حکیم مکرم حسین سنسارپوری دامت برکاتہم سے بڑی عقیدت تھی۔ کئی بار میری سنسارپور موجودگی میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس کے علاوہ بھی اس طرف کا سفر ہوا تو خدمت میں حاضری دی۔ انتقال کی خبر دی گئی تو حضرت والا نے مجھے فون کر کے تعزیت کی اور بہت اہتمام سے دعائے مغفرت فرمائی۔

راہ سلوک میں قدم رکھنے کے بعد ان کی مجاہدہ پسند طبیعت نے تیز گامی سے سفر طے کیا۔ معمولات کی کثرت اور پابندی میں وہ نمونہ اور ''الذاکرین اللہ کثیرا والذاکرات'' کے مصداق خوش نصیب بندگانِ خدا میں سے ہو گئے۔ روزوں کا بہت معمول ہو گیا۔ دوشنبہ و جمعرات اور ایام بیض کے علاوہ بھی کثرت سے روزے رکھتے۔ آخری دو سال تو انہوں نے لگاتار دو دو مہینے کے روزے رکھے۔ کہا کرتے تھے اللہ نے میرے لیے روزہ بڑا آسان رکھا ہے۔ تہجد کی بہت پابندی تھی اور خصوصا دعا و مناجات سے بڑی مناسبت۔ فجر سے ڈیڑھ گھنٹے پہلے اٹھ جاتے۔ نوافل کے بعد کچھ ذکر کرتے۔ طویل اور نہایت رقت کے ساتھ دعائیں مانگتے۔ فجر کے بعد ایک گھنٹہ آرام اور پھر درسی کتب کا مطالعہ و ناشتہ۔ گرمیوں میں چار بجے مدرسے جا کے تلاوت میں مشغول ہو جاتے۔ سردیوں میں اس کے بجائے فجر بعد نہیں سوتے اور تلاوت کرتے۔ عصر بعد مغرب تک ذکر و مراقبہ کا وقت تھا جو عموماً مدرسے میں ہوتا۔ کلمۂ طیبہ کا معمول پانچ سے دس ہزار تک کا تھا۔ مغرب بعد نوافل اور اس کے بعد بھائیوں اور اہل قرابت سے ملاقات کرتے۔

۲۰۱۲ء میں ان کو سلسلے کی اجازت ملی۔ دھیرے دھیرے اس راہ کے طالبین ان کی طرف رجوع ہونے لگے۔ آخری چند سالوں میں یہ رجوع بہت بڑھ گیا۔ سالکین کو بڑا فائدہ پہنچ رہا تھا۔ جمعے کو عصر بعد ذکر کی مجلس ہوتی، جس میں سنبھل مرادآباد اور دہلی وغیرہ کے سالکین شریک ہوتے۔ طبیعت کی رقت بیانات میں بھی خوب ظاہر ہونے لگی۔ سننے والوں پر بہت اثر پڑتا۔ اللہ تعالیٰ کی شان رحمت کا بڑا دل آویز بیان کرتے، خود بھی دعا میں خوب روتے۔ مجمع پر بھی بہت رقت طاری ہوتی۔ رمضان کے آخری ایام سنبھل ہی میں گزارتے۔ آخری راتوں میں شب گزاری کے لیے سیکڑوں کا مجمع آجاتا۔ اجتماعی دعا غیر معمولی ہوتی۔

گزشتہ سال لاک ڈاون میں فرصت ملی تو حدیث شریف سے اشتغال رکھا اور بخاری شریف بڑی محبت سے پڑھی۔ ان کی شخصیت علم ودعوت اور ذکر وعبادت کی جامع ایک بڑے مصلح عالم دین کی شخصیت تھی۔ علاقے میں ہر دینی کام میں نگاہ انہی کی طرف اٹھتی تھی۔ وہ خود بھی عوامی آدمی تھے۔ شادی نکاح، جنازہ اور غسل میت کا کام بڑے اہتمام سے انجام دیتے۔ مغربی یوپی سے لے کر برطانیہ تک لوگ ان سے منسلک تھے۔ وہاں بھی رمضان میں ذکر کی مجالس رہتیں۔ معمول یہ تھا کہ عصر بعد جہاں بیان ہوتا وہیں سے تراویح پڑھ کر بولٹن واپس آتے اور فجر تک ایک مسجد میں تنہا ذکر وتلاوت میں مشغول ہوجاتے۔ سنبھل اور مضافات میں تبلیغی کام کا بڑا تعاون کرتے۔ کام کے ساتھیوں سے بڑا اچھا رابطہ تھا۔ سنبھل کے گزشتہ صوبائی اجتماع کی مہینوں تیاری اور اس کی محنت میں اس طرح لگے کہ اجتماع گاہ میں ہی تقریباً دو ماہ قیام کیا۔ سبق پڑھاتے اور وہیں چلے جاتے۔ وہیں ایک خیمہ لگالیا تھا۔ جوان کی قیام گاہ بھی تھا اور خانقاہ بھی۔ اس اجتماع کی کامیابی اور علاقے پر اس کی تاثیر میں ان کا نمایاں حصہ تھا۔ وہ عمر کچھ مختصر لائے تھے اس لیے لمبی عمروں کا کام جلد نپٹا کر چلے گئے۔

ہر چیز میں بہت نفیس ذوق پایا تھا۔ مدینۃ العلوم صفائی ستھرائی میں نمونہ کا ادارہ ہے۔ گھر پر بھی ان کا کمرہ اور مہمانوں سے ملنے کی جگہ سب نہایت نفیس، لیکن خوب سادہ۔ لباس کا ذوق بھی بہت ستھرا تھا۔ اللہ نے فارغ البالی بھی خوب عطا فرمائی تھی۔ ہمیشہ خوش پوشاک رہتے۔ چائے اور کھانے کے برتن بھی بہت صاف اور نفیس وعمدہ ہوتے۔ ہر جمعہ کو احباب کی دعوت ہوتی۔ آخر سالوں میں جمعے میں شرکت کے لیے باہر کے مہمان بھی ہوتے، بڑی محبت سے ضیافت کرتے۔ اللہ تعالیٰ ان کے برادران ہمارے کلیم الرحمان چچا اور یحییٰ چچا کو اجر عظیم عطا فرمائے، ان لوگوں نے ساری عمر کے لیے طے کیا ہوا تھا کہ ہم کاروبار اور کھیتی دیکھیں گے اور اپنے بھائی کو دینی کاموں کے لیے فارغ رکھیں گے۔ دیگر برادران جناب مولانا ڈاکٹر خالد قاسمی، مرحوم محمد راشد صاحب اور مرحوم حبیب الرحمان صاحب بھی ان کے دینی کاموں میں شروع سے بڑے پشتیبان اور مددگار رہے۔ مولانا

مرحوم کو جو غیر معمولی توفیقات ملیں ان میں ان بھائیوں کی قربانی کا یقیناً حصہ اور ان شاء اللہ ثواب عظیم ہے۔

جیسا کہ ذکر آیا وہ مدرسے سے تنخواہ نہیں لیتے تھے۔ اس کے باوجود مدرسے کی چیزوں میں بڑی احتیاط رہتی۔ میری جو آخری ملاقات وفات سے بس ایک ماہ پہلے سنبھل کے سفر کے موقع پر ہوئی اس کا ایک خاص واقعہ یاد آتا ہے۔ میں نے فون سے کہا کہ میں سنبھل آرہا ہوں، اس مرتبہ کچھ تحریری کام ساتھ ہے اس لیے مدرسے میں قیام کروں گا۔ انہوں نے وضو خانہ کے اوپر جو کمرے مہمان خانے کے بنائے تھے ان میں قیام کا انتظام کرایا۔ میں چائے زیادہ پیتا ہوں اور خاص طور پر فجر سے پہلے پینے کا معمول ہے۔ وہاں ایک چھوٹا سا مطبخ بھی ہے۔ رات کو اس میں چائے کے لیے دودھ منگا کر رکھا اور مجھ سے کہا: یہ صرف عمارت مدرسے کی ہے۔ یہاں سب سامان خانقاہ کا (یعنی ان کا ذاتی) ہے، بے تکلف استعمال کیجیے گا۔

صلہ رحمی ان کی خاص صفت تھی۔ آخر عمر میں اپنے عم بزرگوار حضرت مولانا نعمانیؒ کی بڑی خدمت کی۔ مولانا عتیق الرحمان سنبھلی ان کے چچازاد بھائی ہونے کے علاوہ حقیقی بہنوئی بھی تھے۔ وہ بھی ان پر نہایت شفیق ومہربان تھے۔ اوران کا بھی ان سے بہت خدمت وسعادت مندی کا رشتہ تھا۔ خاندان کی دینی حالت کی بڑی فکر رہتی تھی۔ کبھی کبھی مجھ سے بڑے درد سے کہتے: بھیا! خاندان کے لیے دعا کیا کرو۔ ہمارے خاندان پر اللہ دین کا انعام فرمائے۔ اپنے بچوں اور بھتیجوں کو بہت نصیحت کرتے، خصوصا بچیوں میں حیا کے پہلو اور لباس کی احتیاط کو بہت کہتے۔ اس سلسلے میں ان کے یہاں کوئی مداہنت نہیں تھی۔ لڑکیوں کے فیشن کے لباسوں سے بڑی نفرت تھی۔

مجھے ان کی جو محبت وکرم حاصل تھا وہ بہت بے چین کرتا ہے۔ کیا کیا گنائیں؟ بڑی خوبیوں کا شخص تھا۔ اس کی یاد بہت حسرت ناک ہے۔ ایک دن مکہ سے فون کیا۔ میں مقام ابراہیم کے سامنے کھڑا ہوں، قسم کھا کے کہتا ہوں ابھی ملتزم پر آپ کے لیے بہت دعا کی ہے۔(۱)

جب ہم نے المعہد العالی قائم کیا تو خود اپنے ساتھ ہمارے ایک عزیز معاون مولوی شاہد میاں کو تحصیل کے لیے لے گئے۔ مولوی شاہد بتاتے ہیں کہ کام کے علاوہ وہ دینی واخلاقی تربیت بھی کرتے رہے۔ ۲۰۰۶ء میں ایسا ہوا کہ رمضان میں دس دنوں کے لیے ان کے لندن کی ایک مسجد میں بیانات تھے۔ اور ہمارے اس سے محض ایک کلومیٹر دور ایک دوسری مسجد میں۔ وہ روزانہ دن میں دس بجے کے قریب اور پیدل میری قیام گاہ آتے۔ اور کچھ دیر بیٹھ کر جاتے۔

(۱) رشتے ومرتبے میں بڑے ہونے کے باوجود وہ مجھ سے آپ ہی سے مخاطب ہوتے تھے۔

سالوں ہم دونوں کے رمضان کے ابتدائی پندرہ بیس دن برطانیہ میں گذرے۔ میں یکے بعد دیگر لندن کے دو اسلامی مراکز میں ہوتا اور وہ پریسٹن اور بولٹن میں۔ وہاں غریب الدیاری کا احساس ہوتا تو تقریبا روز ہی فون پر بات ہوتی۔ ایک دن باتوں کے دوران مجھے نصیحت کی کہ یہاں کے لوگ ہم کو بلاتے ہیں۔ بہت مال خرچ کرتے ہیں۔ ان کا حق ہے کہ ان کی دینی خدمت میں بہت اخلاص و نصح سے کام لیا جائے۔ بیانات بہت اہتمام سے اور توجہ سے کیا کرو۔

مجھ سے سنبھل آنے اور جمعہ میں بیان کرنے کا بہت مطالبہ کرتے۔ جب وہاں ہوتا ضرور بیان کرواتے۔ میں سنبھل کا سفر اگر ایسے کرتا کہ جمعے کا دن وہاں نہیں پڑتا تو بڑے مزیدار انداز میں کہتے: ہاں! خبردار، جمعہ کو نہ رُکیو۔ کہیں اللہ کے بندوں کو کچھ فائدہ نہ پہنچ جائے۔ یاد نہیں کہ سنبھل میں کسی جمعہ میں انہوں نے مجھے بیان سے رخصت دی ہو۔ میری ایک ایک تحریر پڑھتے۔ مختلف موضوعات پر اور حالات پر مضمون کی فرمائش کرتے۔ جب کوئی مضمون اچھا لگتا بہت داد اور دعائیں دیتے۔

میری کمر میں کچھ تکلیف رہنے لگی تھی، ڈاکٹر بغیر ٹیک لگائے بیٹھنے کو منع کرتے تھے۔ وہ عمرہ کے سفر پر گئے، وہاں ایک ایسی کرسی دیکھی جو مصلّے پر ٹیک لگا کر بیٹھنے کی تھی، میرے لیے لائے اور خود لکھنؤ پہنچائی۔ ہمارے بچے سنبھل اپنی نانیہال جاتے تو بار بار اپنے گھر بلواتے۔ ایک مرتبہ کہیں سے دعوت کا کھانا آیا، ان کو اطلاع ہوگئی کہ بچے سنبھل پہنچنے والے ہیں۔ اٹھوا کر رکھوا دیا اور اگلے دن پہنچوایا۔

آہ! ہم نے کیسا کرم فرما کھو دیا۔ رفتید و لے نہ از دل ما۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے، مغفرت فرمائے۔ بلند درجات عطا فرمائے۔ ہم سب کو جنت الفردوس میں جمع فرمائے۔ ان کے دینی کام کو قبول فرمائے۔ خصوصا مدرسے کو ترقیات عطا فرمائے۔ ان کے دونوں فرزندوں مولوی عبدالمہیمن، عزیزم عبدالملک اور لائق بیٹی کو ان کا دینی وارث بنائے اور تمام شرور وفتن سے محفوظ رکھے۔

اللّٰھم لا تحرمنا خیرہ و لا تفتنّا بعدہ۔ اِنا للّٰہ وِانا الیہ راجعون۔ اللّٰھم آجرنا فی مصیبتنا واخلف لنا خیراً منھا۔

یادِ رفتگاں

مولانا نظام الدین اسیر ادرویؒ: اسیرِ علم وقلم

نایاب حسن قاسمی

وبائی ہیجان کے دوران ملک کے ایک اور ممتاز عالم دین، مصنف وسوانح نگار مولانا نظام الدین اسیر ادروی کا بھی طویل علالت کے بعد آج انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً پچانوے سال تھی۔ مولانا اسیر ادروی ہندوستان کے گنے چنے کثیر التصانیف اور قابلِ اعتماد اہل قلم میں سے ایک تھے۔ انھوں نے ہندوستانی سیاست، تاریخِ آزادی، سوانح وشخصیات پر درجنوں کتابیں لکھیں۔ سیرت پاک پر ''عہد رسالت: غارِ حرا سے گنبد خضرا تک'' اور دیگر موضوعات، خاص طور پر اکابر علماے دیوبند؛ مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کی زندگی اور کارناموں سے روشناس کرانے والی ان کی کتابیں غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں۔ انھوں نے دیگر کئی علما کی سوانح لکھیں۔ دارالعلوم دیوبند کی علمی ودینی خدمات پر ایک کتاب ''دارالعلوم دیوبند: احیاے اسلام کی عظیم تحریک'' بھی ان کی اہم کتاب ہے، ''دبستانِ دیوبند کی علمی خدمات'' بھی ان کے تحقیقی ذوق کا بہترین نمونہ ہے۔ انھیں اگر مؤرخِ دارالعلوم دیوبند کہا جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا۔ ان سے پہلے سید محبوب رضوی نے دو جلدوں میں تاریخِ دارالعلوم دیوبند لکھی تھی، جوستر کی دہائی میں شائع ہوئی تھی، اس سلسلے کو انھوں نے بڑھایا اور پھیلایا؛ چنانچہ ان کی کم سے کم چھ اہم ترین کتابیں براہِ راست دارالعلوم اور اکابر دارالعلوم کی تاریخ وسوانح سے تعلق رکھتی ہیں، جو دارالمؤلفین اور شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند وغیرہ سے شائع ہوئیں اور متعلقہ موضوع پر بنیادی مصادر کا درجہ رکھتی ہیں۔

ہندوستان کی تحریک آزادی کے وہ چشم دید گواہ؛ بلکہ اس تحریک کے کارپردازوں میں شامل رہے اور طالب علمی کے ساتھ ساتھ سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے رہے، بعد میں ''تحریکِ آزادی میں مسلمانوں کا کردار'' جیسی اہم اور مستند کتاب تالیف کی۔ اس کے علاوہ جمعیت علما کی تاریخ مرتب کی اور تبلیغی جماعت کا علمی دفاع کیا۔ ''تاریخی طبری کا تحقیقی جائزہ'' ان کی معرکۃ الآرا تصنیف ہے، جس میں انھوں نے شہرۂ آفاق کتاب ''تاریخ الامم والملوک'' کے واقعات و روایات کا بے لاگ تجزیہ کیا ہے، ''تفسیروں میں اسرائیلی

روایات'' بھی ان کی بہترین تحقیقی کتاب ہے،معروف عباسی شاعر ابوالطیب المتنبی کے شعری دیوان کی شرح بھی لکھی،فن اسماء الرجال پر بھی ان کی دو کتابیں (فن اسماء الرجال،معجم رجال البخاری) ہیں۔ان کی ایک نہایت اہم کتاب ''افکارِ عالم فکرِ اسلامی کی روشنی میں''،جو دوجلدوں اور ۸۲۹ر صفحات پر مشتمل اور ان کے ۲۹ر علمی،فکری،ادبی،تحقیقی وتنقیدی مقالات کا مجموعہ ہے۔طباعت کے لحاظ سے ان کی غالباً آخری تصنیف ان کی خودنوشت سوانح ''داستانِ ناتمام'' (دوجلدیں) ہے،جو ۲۰۰۹ میں مکتبہ حسینیہ دیوبند سے شائع ہوئی،حالاں کہ یہ کتاب بھی بہت پہلے کی لکھی ہوئی تھی،اس کے آخری صفحے پر یکم جنوری 1996 کی تاریخ درج ہے اور شروع میں ''یہ کتاب'' کے عنوان سے ایک صفحے کی تحریر ہے،جس کے آخر میں ۲۷ ستمبر ۲۰۰۵ کی تاریخ پڑی ہوئی ہے۔خودنوشت کے کل صفحات ۳۳۸ ہیں اور اخیر کے دوصفحات میں مولانا کی تصانیف کی فہرست درج ہے،جس میں ۲۶ر مطبوعہ اور چار گم شدہ کتابوں کے نام درج ہیں۔ان چاروں میں ایک افسانوی مجموعہ،ایک شعری مجموعہ،ایک کتاب ''کمیونزم تجربات کی کسوٹی پر'' اور ایک کتاب ''غدارانِ وطن'' ہے۔مولانا نے اپنی کتابوں کا چندسطری تعارف بھی لکھا ہے۔

مولانا کا اسلوبِ تحریر بہت صاف ستھرا،نکھرا اور شستہ تھا،حالاں کہ مؤرخانہ رنگ ان کے یہاں حاوی تھا،مگر اسلوبِ بیان کی شیرینی کو وہ ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ان کی ہر کتاب میں جہاں معلومات کی فراوانی ہوتی ہے،وہیں طرزِ بیان کا حسن وجمال بھی بہ تمام وکمال پایا جاتا ہے۔انھوں نے بے ساختہ لکھا اور بے پناہ لکھا ہے،ان کی تحریروں کی روانی خاص طور پر قلب ونگاہ کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور انھیں پڑھنے کے لیے خواہ مخواہ دل مچلنے لگتا ہے۔ہماری ان سے واقفیت ''تحریکِ آزادی اور مسلمان'' نامی کتاب سے ہوئی جو دارالعلوم دیوبند اور اس سے وابستہ مدارس کے درجہ عربی پنجم میں داخلِ نصاب ہے۔بعد میں ان کی دوسری کتابیں بھی کبھی شوق سے اور کبھی علمی ضرورت کے تحت پڑھتے رہے،ان کی آخری کتاب ''داستانِ ناتمام'' پڑھی اور خوب محظوظ ہوئے۔اس کتاب میں ان کا اسلوب خاصا دل فریب اور شوخ ورنگین ہے۔یہ کتاب مولانا کی سوانحِ حیات ہونے کے علاوہ بہت سی دوسری تاریخی،علمی وادبی معلومات کا گنجِ گراں مایہ بھی ہے اور اس میں ایک خودنوشت کے سبھی ادبی وفنی لوازم اپنی تمام تر رعنائی وزیبائی کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔مولانا نے حالات وواقعاتِ زندگی کو بیان کرنے میں اپنی علمی برتری یا دینی حیثیت وشخصیت کو آڑے نہیں آنے دیا ہے اور پوری دیانت اور صفائیِ قلب و قلم کے ساتھ اپنی بیتی بیان کرتے گئے ہیں،جس کی وجہ سے اس میں ان کی شخصیت کا ہر رنگ بالکل نمایاں اور چوکھا ہے۔پھر چوں کہ انھوں نے بڑی ماجرا پرور زندگی گزاری اور حصولِ علم اور عملی زندگی کے مختلف مراحل میں

بے شمار شخصیات، کئی اداروں اور تنظیموں سے ان کا راست واسطہ رہا، سو ان کے حوالے سے اپنے تجربے کو بھی مولانا نے بے کم و کاست بیان کر دیا ہے، کتاب کا یہ وصف بھی بے پناہ دلکشی کا حامل ہے۔

مولانا کی پیدائش ۱۹۲۶ کی تھی، ابتدائی تعلیم وطن میں اور اس کے بعد مئو اور اعظم گڑھ کے مشہور اداروں مفتاح العلوم، احیاء العلوم ارو دارالعلوم مئو میں مشکوٰۃ تک کی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد دیوبند پہنچے، مگر وہاں داخلہ نہ ہوسکا (جس کی وجہ دلچسپ تھی، جاننا چاہیں، تو ان کی خودنوشت کے صفحہ ۶۶ تا ۷۱ کا مطالعہ فرمائیں)۔ پھر مدرسہ شاہی گئے اور وہاں سے ۱۹۴۲ میں فراغت حاصل کی، اسی سال ''ہندوستان چھوڑ دو تحریک'' میں بھی حصہ لیا۔ قاضی اطہر مبارکپوری کی دعوت پر ۱۹۴۷ کے شروع میں لاہور گئے اور اخبار ''زمزم'' میں کام کیا، عثمان فارقلیط اس کے ایڈیٹر اور قاضی صاحب ان کے معاون تھے۔ وہاں احسان دانش، تاجور نجیب آبادی، ابوسعید بزمی وغیرہ سے ملاقاتیں رہیں۔ اس کے بعد لمبے عرصے تک اپنے وطن میں رہے، مختلف علمی و ادبی سرگرمیوں میں مصروف، ستر کی دہائی میں چار سال جمعیت علما یوپی کے صدر دفتر لکھنؤ میں آفس سکریٹری رہے اور خاص طور پر مشرقی یوپی میں جمعیت کو متحرک اور سرگرم کیا، جمعیت کو فائدہ پہنچانے کے لیے دیگر بہت سے اقدامات کیے (جنھیں اپنی خودنوشت میں انھوں نے بیان کیا ہے) قیامِ لکھنؤ کے زمانے میں متعدد بڑے علما اور ادیبوں سے خاص تعلق رہا۔ ۱۹۷۸ میں جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب بنارس سے وابستہ ہوئے، یہاں تدریسی خدمات انجام دیں، ادارے کی علمی شناخت اور تعلیمی وقار میں اضافہ کیا، سہ ماہی رسالہ ''ترجمان الاسلام'' نکالا، جو مدرسوں کے روایتی رسائل سے مختلف اور علمی و تحقیقی خصائص کا حامل تھا، وہ جب تک صحت مند رہے، نہایت سرگرم رہے، علم وفکر کے جام لٹاتے، طلبۂ علومِ نبوت کو سیراب کرتے اور قلم و قرطاس کی ہم نیشنی میں شب روز گزارتے رہے، انھوں نے ذاتی محنت، ذوقِ تحقیق و جستجو، قلندرانہ شان اور درویشانہ استغنا و بے ریائی کی بدولت علمی حلقوں میں غیر معمولی وقار و اعتبار حاصل کیا، ان کی تحریریں مستند سمجھی جاتی تھیں اور ان کی باتوں میں وزن ہوتا تھا۔

مولانا ادروی تدریس کی راہ پر فراغت کے تقریباً ۳۵ر سال بعد آئے تھے، اس سے پہلے وہ علمی و ادبی مشاغل کے ساتھ سیاسی و تنظیمی سرگرمیوں میں منہمک رہے، اس دوران انھیں بارہا سطحی، مگر پیچیدہ سیاستوں سے بھی واسطہ پڑا؛ لیکن ''اسیر'' ہونے کے باوجود کبھی کوئی انھیں رام کرنے یا پھانسنے میں کامیاب نہ ہوسکا، انھوں نے پوری زندگی اپنی شرطوں پر بسر کی، علم کو رسوا نہ ہونے دیا، قلم کی عظمتوں کے پاسدار رہے، ہمیشہ اپنے ضمیر کی آواز سنی، ان کے نام کے ساتھ لاحقہ تو ''اسیر'' کا تھا، مگر ذہن وفکر اور زبان و دل کی اسیری انھوں نے کبھی گوارہ نہ کی۔ اللہ پاک دائمی زندگی کے سکون اور راحتوں سے نوازے۔

فقہ وفتاویٰ

آپ کے شرعی مسائل

از: مفتی ندیم الدین قاسمی*

کیا ''درودتاج'' کا ثبوت احادیث سے ہے؟

سوال: ''درودتاج'' کسی حدیث سے ثابت ہے یا نہیں؟

جواب: درود تاج کوئی ایسا درود نہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہو، اور اس کے بعض جملے مفہوم کے لحاظ سے قابلِ اعتراض بھی ہیں، اس سے بہتر وہ درود ہیں جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہیں، جیسے نماز کا درود یہ سب سے افضل واعلیٰ درود ہے۔ (کفایت المفتی: ۲/ ۱۰۱)

بالوں کی پیوند کاری

سوال: ایک شخص کے بال گر گئے ہیں اور آج کل ڈاکٹرز نے ایک آپریشن ایجاد کیا ہے کہ اپنے ہی سر کے ایک حصے کے بال نکال کر دوسرے حصے میں پیوند کرتے ہیں جو قدرتی طور پر بڑھتے ہیں۔ کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

جواب: گنجے پن کے عیب کو دور کرنے کے لئے اپنے ہی سر کے ایک حصے کے بال نکال کر دوسرے حصے میں لگوانے کی گنجائش ہے؛ لیکن محض بال گرنے کی وجہ سے اس تکلف کی ضرورت نہیں اور کسی غیر کے بال لگانے کی اجازت نہیں۔ (کتاب النوازل: ۱۶/ ۲۳۱)

نمازِ جنازہ میں ہاتھ کب چھوڑنا چاہیئے؟

سوال: نماز جنازہ کی آخری تکبیر کے بعد ہاتھ کب چھوڑنا چاہئے؟ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ تکبیر کے بعد دونوں ہاتھ چھوڑ کر سلام پھیرنا چاہئے اور کچھ کہتے ہیں کہ دائیں طرف سلام پھیرتے وقت دایاں اور بائیں طرف سلام پھیرتے وقت بایاں ہاتھ چھوڑنا چاہئے؟

جواب: اس سلسلے میں تین اقوال ہیں دو تو یہی ہیں جو آپ نے ذکر کیے، تیسرا یہ ہے کہ دونوں طرف سلام پھیرنے کے بعد ہاتھ چھوڑے یہی اکثر مفتیان کی رائے ہے، اور اکابر کے یہاں بالعموم معمول یہی ہے۔

(فتاویٰ دارالعلوم: ۵/ ۲۱۸)

---

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

ASHRAFUL JARAID MONTHLY Rs20/-
RNI No: APURD/2007/24089 Postal. No: HSE/884/20-22
Date of Publication 3rd Aug-21, date of Posting 5th Aug-21

Printed.Published and Owned by Mohd Abdul Qavi, # 17-1-391/2, Khaja Bagh, Sayeedabad Colony, Hyderabad- 500059
Published from: # 17-1-391/2, Khaja Bagh, Sayeedabad Colony, Hyderabad- 500059
Editor : Mohammed Abdul Qavi. Printed at: Aish Offset Printers, Behind Masjid e Meraj, Sayeedabad, Hyd.